الکٹرانک کاروبار کے شرعی ضوابط واحکام

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

الکٹرانک کاروبار کے
شرعی ضوابط واحکام

مؤلف

مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

نام کتاب : الکٹرانک کاروبار کے شرعی ضوابط واحکام

مؤلف : مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم ، بنگلور

صفحات : ۱۲۴

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

الفہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید الأنبیاء و أشرف المرسلین و علی آلہ و صحبہ أجمعین ، أما بعد:

یہ بات کون نہیں جانتا کہ آج کا یہ دور مختلف قسم کی مادی ترقیوں اور ظاہری نیرنگیوں، حیرت انگیز ایجادات اور محیر العقول تحقیقات کا دور ہے۔ اور جب سے جدید صنعتی وفکری انقلاب نے جنم لیا ہے روز روز تعجب خیز اور حیرت زا ایجادات وتحقیقات سامنے آتے جاتے ہیں، ہر چیز کے نئے نئے انداز وطریقے وجود پذیر ہوتے جاتے ہیں اور اسی ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ماکولات، مشروبات، ملبوسات کی نت نئی اقسام وانواع کا ایک غیر مختتم سلسلہ اس جہاں رنگ وبو میں نظر آتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ تجارتی دنیا میں کاروبار کی ایسی صورتیں اور شکلیں پیدا کر دی گئی ہیں جن کا ماضی میں کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

انہی جدید کاروباری طریقوں میں سے ایک طریقہ وہ ہے جس کو "آن لائن خرید وفروخت" یا "الکٹرانک تجارت" اور انگریزی میں (Electronic Business) یا (E-Business) کہا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک ہر معاملے اور ہر کاروبار میں، خواہ قدیم ہو یا جدید، یہ لازم ہے کہ وہ قانون شریعت کے دائرے میں اور اس کے قواعد وضوابط کے مطابق ہو؛ لہذا جو بھی نئے انداز کا کوئی معاملہ یا کاروبار سامنے آئے تو ایک مسلمان ہونے کی

حیثیت سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس کا حکم شرعی معلوم کرے کہ یہ معاملہ جواز کے حدود میں آتا ہے یا عدم جواز کے؟ اگر جواز کے حدود میں آتا ہو تو اس کو اختیار کرے اور حرمت یا کراہت کے حدود میں آتا ہو تو اس سے بچنے کا اہتمام کرے۔

اگر ایک جانب عوام الناس کی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ وہ جدید معاملات و مسائل کا شرعی حل علماء سے معلوم کریں تو دوسری جانب حضرات علمائے کرام بالخصوص اصحاب فقہ وفتوی وارباب اجتہاد ونظر کے کندھوں پر اس سلسلے میں بہت اہم اور بڑی ذمے داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطاء فرمودہ تفقہ اور بصیرت اور اجتہادی قوت وصلاحیت سے کام لیتے ہوئے ان جدید پیش آمدہ مسائل کا حکم شرعی دریافت کریں اور لوگوں کے سامنے پیش کرکے امت کی رہبری کا فریضہ انجام دیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جدید مسائل کی ان صورتوں اور بالخصوص کاروباری مسائل کی جدید شکلوں کا حکم شرعی قرآن وحدیث کی نصوص اور فقہائے مجتہدین کے کلام میں صراحت کے ساتھ ملنا ممکن نہیں ہے؛ کیوں کہ جدید کاروباری صورتوں اور شکلوں میں سے بیشتر آج کے مشینی دور اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانے کی پیداوار اور ایجاد ہیں، پہلے یہ صورتیں اور شکلیں موجود نہیں تھیں، لہذا ان کا ذکر نصوص قرآن وسنت میں یا حضرات علمائے مجتہدین کے استنباطات میں واضح طور پر تو نہیں ملے گا؛ لیکن قرآن وسنت کے اسلوبِ بیان کا اعجاز اور ان کی مافوق العادۃ بلاغت، نیز فقہائے کرام کی فقیہانہ ومجتہدانہ صلاحیت اور ان کی بالغ نظری و بلند نگاہی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں تفکر وتدبر کرنے والوں کو ایسے اصول و قواعد مل جاتے ہیں جن کی روشنی میں ان جدید مسائل کا حل تلاش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

لہذا ہر زمانے کے اہل نظر واجتہاد علما کی ذمے داری ہے کہ اپنے اپنے دور میں پیش آنے والے نئے مسائل کی ان قواعد واصول کی روشنی میں تخریج کریں اور ان کا حل تلاش کریں؛ چناں چہ ہر دور میں علمائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں پیش آمدہ جدید مسائل

کے سلسلے میں غور وفکر سے کام لیتے ہوئے، اصول شرع اور قواعدِ فقہ کے تحت ان مسائل کے تخریج واستنباط کا کام کیا اور ساتھ ہی ساتھ شریعت کے مزاج و اصول کے مطابق انسانی مصالح اور ضروریات زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان مسائل میں افراط وتفریط سے پاک معتدل راہ اختیار کی، ان حضرات نے نہ تو ان مسائل سے صرف نظر کرنے اور خواہ مخواہ کے جمود و تنگ نظری کو روا رکھتے ہوئے ہر نئی چیز اور ہر جدید نظام کو ناجائز قرار دیا اور نہ ان میں تساہل وسہل انگاری سے کام لیتے ہوئے ہر معاملے کو جائز قرار دینے اور اس کے لیے شریعت میں وجہ جواز پیدا کرنے کی کوشش کی، بل کہ ان دونوں کے مابین افراط وتفریط کی دو انتہاؤں سے بچتے ہوئے اُس معتدل راہ کو اپنایا جو مزاج شریعت سے ہم آہنگ ہے۔

زیرِنظر رسالہ میں ہم نے ''الکٹرانک تجارت''(Electronic Business) کے سلسلے میں اسی اصول کے تحت کلام کیا ہے اور اس کے متعلق احکام شرعیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور قدیم فقہا کے کلام سے مسائل حاضرہ کے نظائر کو پیش کرنے کے ساتھ یہ کوشش بھی کی ہے کہ ان احکام کے سلسلے میں دور حاضر کے یا قریبی دور کے فقہائے کرام نے جو کلام کیا ہے، اس کو بھی مدّنظر رکھا جائے، چناں چہ حتی المقدور علمائے عرب اور علمائے ہند و پاک میں سے جنھوں نے جدید مسائل پر کلام کیا ہے ان کی تحقیقات کو ہم نے اہمیت کے ساتھ لیا ہے اور الکٹرانک تجارت کے مسائل کو معتدل راہ پر حل کرنے کی کوشش کی ہے؛ مگر یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ جدید مسائل چوں کہ فی الواقع جدید حالات کی پیداوار ہیں اور ان کا حکم منصوص نہیں ہے، اس لیے ان کے احکام کی تخریج میں علما کے مابین اختلاف نظر وفکر کا ہونا ایک فطری وطبعی امر ہے؛ لہذا یہاں بھی ممکن ہے کہ بعض آراء سے دوسرے حضرات علما کو اختلاف ہو، اور یہ کوئی تعجب خیز امر ہے، نہ کوئی معیوب بات؛ بل کہ علمی دنیا کی ایک جانی پہچانی جنس ہے؛ لہذا اگر کسی کو کوئی اختلاف ہو تو وہ اپنے نقطۂ نظر کو بہ دلائل واضح کر سکتے ہیں۔

اور احقر یہاں یہ کہتے ہوئے کسی قسم کی تواضع سے کام نہیں لے رہا ہے کہ یہاں اس بات کا بھی قوی وشدید امکان ہے کہ کسی مسئلے میں کوئی استنباطی سقم وخامی رہ گئی ہو، یا کسی جگہ سہو ونسیان کا دخل ہو گیا ہو؛ لہذا احقر حضرات علمائے کرام کی خدمات عالیہ میں عرض گزار ہے کہ جن حضرات کو احقر کی کسی خطا وغلطی پر اطلاع ہو وہ حضرات متنبہ فرما کر عند اللہ ماجور ہوں؛ تاکہ دوسرے اڈیشن میں اس کی تلافی واصلاح کی جا سکے۔

اخیر میں دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس تحریر کو شرف قبول سے نوازے اور اس کو احقر کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

۲۳-صفر المظفر ۱۴۳۸ھ
مطابق ۲۴-نومبر-۲۰۱۶ء

فقط
محمد شعیب اللہ خان
جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

الکٹرانک کاروبار کی تاریخ اور حقیقت

الکٹرانک کاروبار کا تاریخی جائزہ

آج کے دور میں آن لائن کاروبار (جس کو الکٹرانک تجارت بھی کہتے ہیں) عالمی پیمانے پر رواج پا چکا ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک میں یہ پورے عروج واستحکام کے ساتھ جاری وساری ہے، جب سے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے عالمی پیمانے پر رواج پایا ہے، اس وقت سے آہستہ آہستہ تجارت نے بھی اپنے قدیم اور پرانے رسمی طریقوں کی جگہ نئے نئے انداز اور طریقوں کو قبول کرنا شروع کر دیا اور اب یہ ''الکٹرانک طریقِ تجارت'' عالمِ اقتصادیات میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے اور ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ ''یہ الکٹرانک تجارت اس عالمگیریت کے دور (Global Age) میں تجارتی حکمتِ عملی کا ایک مضبوط عنصر اور اقتصادیاتی ترقی کے لیے ایک بہترین محرّک کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز الکٹرانک کاروبار نے عالمی سطح پر ہر قسم کے سامان اور اشیاء کے بیچنے اور خریدنے والوں اور ان کے مابین کام کرنے والی ایجنسیوں کو وسیع پیمانے پر اپنی اشیاء اور خدمات سے متعارف کرانے اور ان کی نکاسی کا ایک بہترین موقعہ فراہم کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے الکٹرانک تجارت کا سلسلہ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں آغاز ہوا اور اس کی ابتداء بعض کمپنیوں کے مابین رقوم کے الکٹرانک تبادلے (Transfer Fund Electronic) سے ہوئی۔ پھر اس میں مزید وسعت ہوئی تو کارخانوں، خدمتی

اداروں، شیئرز کمپنیوں اور سفری ٹکٹ وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔پھر ۱۹۹۰ء کے اثناء میں انٹرنیٹ ایک مالی فائدے کے مادہ کی حیثیت سے سامنے آیا اور اس کا پھیلاؤ بڑھتا چلا گیا اور لاکھوں انسانوں تک یہ پہنچ گیا اور الکٹرانک تجارت کی اصطلاح ظہور میں آئی اور اسی کے ساتھ مختلف اداروں اور کمپنیوں کے بین تنافس و تقابل (Competition) نے شدت پکڑی اور الکٹرانک پروگرام اور ویب سائٹس نے ترقی کی، یہاں تک کہ ۱۹۹۲ء میں عالمی ویب سائٹ (WWW) سامان اور خدمات کی ترویج کے لیے قائم ہوئی، پس کاروباری لوگ اور اداروں اور کمپنیوں کے ذمے داران ویب سائٹوں پر آنے لگے اور اپنے کاروباری معاملات ای میل (E-Mail) سے انجام دینے لگے اور دوسری جانب اپنے سامان (Products) اور خدمات (Servises) بھی اپنے اپنے ویب سائٹوں پر جن کو انھوں نے جاری کیا ہوا تھا، پیش کرنے لگے۔

اور سنہ ۱۹۹۵ء کے بعد اشتہارات، نیلامی وغیرہ کے میدان میں نئے نئے معاملات عام ہوئے جب کہ کمپنیوں نے اپنے اپنے ویب سائیٹ جاری کئے اور ان کو اپنی کمپنیوں سے متعلق معلومات سے بھر دیا اور سنہ ۱۹۹۶ء میں یہ تقابل و تنافس ''الکٹرانک کاروبار'' کو رواج دینے میں نٹ سکیپ (Netscape) اور میکروسافٹ (Microsoft) کمپنیوں کے مابین برابر جاری رہا اور پھر وہیں سے ان کے اور (Apache) کے مابین بھی بعض سستے اور مفت سافٹ ویر جاری کرنے کے سلسلے میں تنافس وتقابل (Competition) رہا۔

پھر ولایت متحدہ امریکہ نے اس نظام تجارت کو مزید تقویت دیتے ہوئے بڑے بڑے تجار کی توجہ ''ویب سائیٹس'' کی جانب کی تو یہیں سے اس کی جانب لپکتے ہوئے ان تجار نے اس حوالے سے اپنا نام پیدا کیا اور اس طرح اس طریق تجارت نے سارے عالم پر اپنا سایہ ڈال دیا۔

اس الکٹرانک تجارت کے اثر ونفوذ کا حال یہ ہے کہ فرانس میں ۱۹۹۶ء میں اگر

الکٹرانک تجارت کا سلسلہ چودہ فی صد تھا تو ۱۹۹۷ء میں صرف ایک سال کے بعد چوبیس فی صد ہوگیا اور اس سلسلے کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ۱۹۹۸ء میں یہ بڑھ کر ۴۸ فی صد تک پہنچ گئے اور امریکہ میں ۱۹۹۶ء میں مختلف اجناس کی خرید وفروخت ۵۱۸ ملین ڈالر کی ہوئی اور یہ نسبت بڑھ کر ممکن ہے کہ ۶۵۷۹ ملین ڈالر تک پہنچ جائے۔

الغرض اس وقت الکٹرانک کاروبار عالمی پیمانے پر چھایا ہوا ہے جس نے آہستہ آہستہ قدیم روایتی کاروباری طریقوں کو پس پشت ڈالنا شروع کردیا ہے اور ممکن ہے کہ چند برسوں کے بعد روایتی طریق تجارت اس قدر کم ہو جائے کہ بقول بعض ''الکٹرانک تجارت'' سے لفظ ''الکٹرانک'' ہی ختم ہو جائے اور صرف لفظ تجارت ہی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی سمجھا جائے۔(۱)

الکٹرانک تجارت کی تعریف

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ ''الکٹرانک تجارت'' کسے کہتے ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے؟ مگر اس سوال پر جب غور کیا جاتا ہے تو عجیب بات یہ ہے کہ یہ اصطلاح آجکل کثیر الاستعمال ہونے کے باوجود اس کی کوئی جامع وواضح تعریف ماہرین اقتصادیات نے نہیں کی ہے اور انھوں نے اس میں کافی اختلاف کیا ہے۔

بعض ماہرین اقتصادیات نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

Electronic commerce is the buying selling, marketing and servicing of products and sevices via computer networks.(۲)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھو: قانون التجارة الالکترونية ،لعبد الرزاق عمر جاجان الزايد ۱۰-۹، العقد الالکتروني للدکتور ماجد محمد سليمان ابا الخيل:۲۳-۲۱،التجارة الالکرونية في الشريعة: ۹-۸، (Indroduction to E-business by Colin Combe , p :5- 7)

(۲) Indroduction to E-business by Colin Combe , p :1

(الکٹرانک اقتصاد یا تجارت کمپیوٹر نیٹ ورک کے ذریعے سامان کی خرید و فروخت کرنے، شاپنگ یعنی اپنے سامان کو بازار میں لانے کے طریقے تلاش کرنے اور مختلف قسم کی خدمات انجام دینے کا نام ہے۔)

بعض حضرات نے کہا ہے:

"إنه وسيلة من أجل إيصال المعلومات، أو الخدمات، أو المنتجات عبر الهاتف، أو عبر الشبكات الكمبيوترية، أو عبر أي وسيلة تقنية"

(یہ الکٹرانک تجارت معلومات، خدمات اور سامان کو فون یا ویب سائیٹ یا کسی بھی ٹکنیکل ذریعے سے پہنچانے کا وسیلہ ہے۔)(۱)

ایک تعریف ''الکٹرانک تجارت'' کی یہ کی گئی ہے:

''الکٹرانک تجارت'' دراصل الکٹرانک آلات و وسائل (جیسے سیل فون، کمپیوٹر، انٹرنیٹ وغیرہ) کے ذریعے کاروبار کا نام ہے۔(۲)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ الکٹرانک تجارت دراصل الکٹرانک وسائل کے واسطے سے انجام دی جانے والی تجارتی سرگرمیوں کو کہا جاتا ہے اور یہ الکٹرانک وسائل متعدد ہیں، جیسے، ٹیلی فون، فیاکس، ٹیلکس، پیجر، لاسلکی، سیل فون، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ؛ لہذا ان سب الکٹرانک چیزوں کی مدد سے سامان کی خرید و فروخت اور متعدد خدمات (Sevices) کی پیش کش یا مختلف قسم کی معلومات کی فراہمی اور ان کی تحصیل کا نام ''الکٹرانک تجارت'' ہے؛ لیکن ان میں سے بعض چیزیں اب اس پیمانے پر مستعمل نہیں ہیں جیسے پہلے دور میں تھیں، جیسے پیجر، ٹیلکس وغیرہ اور بعض چیزوں کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، جیسے سیل فون، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اور ان میں بھی انٹرنیٹ کے وسیلے سے کاروبار سب سے زیادہ رائج ہوتا جا رہا ہے؛ اس لیے بعض

---

(۱) التجارة الإلكترونية للبسام نور:٦

(۲) التجارة الإلكترونية في الشريعة للدكتور جمال عبود محمد الذيب:٧

حضرات نے الکٹرانک تجارت کو صرف کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے واسطے سے کیے جانے والے کاروبار تک محدود کردیا ہے؛لہذا الکٹرانک کاروبار کی اس بحث میں ہم بھی زیادہ تر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہونے والے کاروبار سے تعرض کریں گے اور ضمناً دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہوسکتا ہے۔

الکٹرانک تجارت کا طریق کار

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آج کے دور میں انٹرنیٹ کی ترقی اور وسعت نے اچھے برے بہت سے کام اس سے متعلق کر رکھے ہیں اور ان میں سے کاروباری معاملات بھی ہیں جنھیں اس سے متعلق کردیا گیا ہے۔

اور یہ کاروباری معاملات دو قسم کے ہیں: ایک عقد بیع (یعنی خرید وفروخت کا معاملہ) دوسری اجارہ (یعنی کرایہ داری کا معاملہ) جیسے مختلف قسم کی خدمات (Sevices)۔

انٹرنیٹ پر مختلف ویب سائیٹس (Web sites) موجود ہیں، جن سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ کر کے کسی بھی قسم کی چیز کا آرڈر دیا جاسکتا ہے اور اپنی پسندیدہ اشیاء خریدی جاسکتی ہیں، اسی طرح کوئی خدمت کسی سلسلے کی لینا چاہیں تو انٹرنیٹ کی مدد سے متعلقہ ویب سائیٹ پر جا کر وہ خدمت بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے:

(۱) ویب سائیٹ پر جا کر جس چیز کی خریداری مطلوب ہے اس کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور ان ویب سائیٹوں سے مبیع کی نوعیت، اس کی صفت وکیفیت اور اس کی قیمت وغیرہ امور معلوم ہو جاتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی خدمت درکار ہے تو اس کی تفصیلات بھی معلوم کی جاسکتی ہیں؛لہذا مذکورہ معلومات کے بعد جو چیز پسند ہو یا جو خدمت مطلوب ہو اس پر کلک کردیا جاتا ہے۔

(۲) یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ قیمت کس طرح سے ادا کی جائے گی، مثلاً کریڈیٹ کارڈ

سے یا چیک سے یا منی آرڈر سے۔

(۳) اپنا نام و پتہ وغیرہ کا اندراج کر دیا جاتا ہے تاکہ مبیع وہاں پہنچائی جا سکے۔

جب یہ واضح ہوا کہ ''الکٹرانک تجارت'' کیا ہے اور اس کا طریق کار کیا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ یہاں اسی قسم کے سوالات کا شرعی حل اور حکم پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔
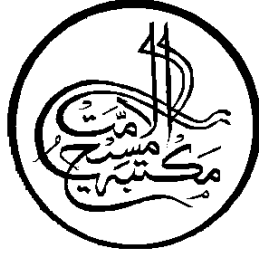
مقصدِ اول

شریعت میں کاروبار کے عام اصول وضوابط اوران کاالکٹرانک کاروبار پرانطباق

ایک اصولی بات

سب سے پہلے یہاں ایک اصولی بات یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عقد بیع وشراء کے جواصول و طریقے شریعت میں مقرر ہیں اور حضرات فقہائے کرام نے اس کی توضیح وتشریح کی ہے، وہی اصول وطریقے کسی بھی بیع وشراء میں جاری ہوں گے، خواہ کوئی قدیم طریق بیع وشراء ہو یا کوئی جدید انداز، اسی طرح اجارے اور کرایہ داری کے جو اصول اور طریقے شریعت میں پہلے سے مقرر ہیں، وہی ہر نئے طریقے میں بھی جاری ہوں گے، لہذا یہ دیکھنا ہوگا کہ شریعت کے جو عام اصول بیع وشراء اور عقد اجارے کے سلسلے میں مقرر ہیں، وہ اس نئے انداز کی تجارت اور کاروبار میں جس کو ''الکٹرانک تجارت'' کہا جاتا ہے، پائے جاتے ہیں اور اس پر جاری ہوتے ہیں یا نہیں؟ اگر جاری ہوتے ہیں تو اس پر جواز کا اور جاری نہیں ہوتے تو جس حد تک جاری نہیں ہوتے اس حد تک عدم جواز کا حکم کیا جائے گا۔

لہذا اولاً یہاں ''عقد بیع وشراء'' اور ''عقد اجارے'' کے جو عام اصول شرع میں مقرر ہیں، ان کا ذکر کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ اس جدید کاروبار ''الکٹرانک تجارت'' پر ان کا کس حد تک انطباق ہو رہا ہے؟ نیز اس سلسلے میں معاصر علمائے کرام کے نقاط نظر بھی پیش کیے جائیں گے۔

پہلے ہم عقد بیع وشراء کے سلسلے میں کلام کریں گے، پھر عقد اجارہ پر گفتگو کی جائے گی۔

عقدِ بیع وشراء کے اصول اور الکٹرانک تجارت

شریعتِ اسلامیہ میں عقد بیع وشراء یعنی خرید وفروخت کا معاملہ جائز وصحیح ہونے کے لیے چند اصول وضوابط مقرر ہیں، جن کا وجود کسی بھی تجارت کی صحت و جواز کے لیے لازم ہے۔لہذا ہم یہاں ان میں سے اہم اصول وضوابط پیش کر کے یہ دکھائیں گے کہ الکٹرانک تجارت ان پر کہاں تک منطبق ہوتی ہے؟ اگر منطبق ہوتی ہے تو وہ جائز اور صحیح ہوگی اور اگر منطبق نہیں ہوتی تو صحیح وجائز نہیں ہوگی۔

پہلا اصول-طرفین کی رضامندی

عقد بیع کا ایک عام اصول یہ ہے کہ عقد بیع کی صحت کے لیے طرفین (خرید وفروخت کرنے والے دونوں فریق) کی رضامندی لازم وضروری ہے، اگر بائع (بیچنے والا) راضی ہے اور مشتری (خریدار) راضی نہیں یا اس کے برعکس صورت ہو تو یہ بیع جائز ودرست نہیں ہوتی۔

''الکٹرانک تجارت'' میں آپسی رضامندی تو پائی ہی جاتی ہے؛ کیوں کہ جب کوئی شخص انٹرنیٹ کے ذریعے کسی ویب سائیٹ پر پہنچ کر کوئی معاملہ طے کرتا ہے تو خریدی جانے والی چیز کی تفصیلات اس کے سامنے آجاتی ہیں جن میں چیز کی جنسیت، نوعیت، کیفیت، کمیت اور قیمت وغیرہ سب معلوم ہوجاتے ہیں اور وہ شخص ان کو جان کر اپنی جانب سے رضامندی کا اظہار اس خانے میں کلک کر کے کر دیتا ہے جو اس کے لیے مقرر ہے۔لہذا ظاہر ہے کہ یہ اس کی رضامندی ہی سے ہوتا ہے۔

اسی طرح جو شخص یا کمپنی اور ادارہ کوئی چیز اس طریق سے فروخت کرنا چاہتا ہے، وہ بھی اپنی رضا ہی سے بیچتا ہے۔لہذا یہاں دونوں طرف سے رضامندی کا پایا جانا مسلم ہے۔

دوسرا اصول-عقد بیع کے لیے تین امور لازم ہیں

عقد بیع کا دوسرا عام اصول یہ ہے کہ کسی بھی عقد بیع کے لیے لازم ہے کہ تین چیزیں پائی

جائیں :ایک صیغہ (جس کو ایجاب وقبول کہتے ہیں) دوسرے عاقدین (خریدنے اور بیچنے والے دو شخص) اور تیسرے معقود علیہ (وہ چیز جس پر یہ معاملہ ہو رہا ہے۔)

ان تین چیزوں کے لازم ہونے پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔ البتہ اس میں ان حضرات کے مابین اختلاف ہے کہ یہ تینوں امور ارکان میں داخل ہیں یا نہیں؟ حنفیہ کے نزدیک ان میں سے ایک چیز رکن ہے اور وہ ہے ایجاب وقبول اور دوسرے فقہا کے نزدیک یہ تینوں امور ارکان میں داخل ہیں۔

یہ اختلاف صرف ان امور کے رکن ہونے یا نہ ہونے میں ہے؛ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ امور بھی عقد بیع میں موقوف علیہ کا درجہ رکھتے ہیں اور لازم وضروری ہیں۔

''الموسوعة الفقهية''میں ہے:

''وَ اتَّفَقَ الْفُقَهَاءُ عَلَى أَنَّ الْعَقْدَ لا يُوجَدُ إِلَّا إِذَا وُجِدَ عَاقِدٌ، وَ صِيغَةٌ (الْإِيجَابُ وَ الْقَبُول) وَ مَحَلٌّ يَرِدُ عَلَيْهِ الْإِيجَابُ وَ الْقَبُولُ (الْمَعْقُودُ عَلَيهِ)وَ ذَهَبَ جُمْهُورُ الْفُقَهَاءِ إِلَى أَنَّ هَذِهِ الثَّلَاثَةَ كُلَّهَا أَرْكَانُ الْعَقْدِ. وَ ذَهَبَ الْحَنَفِيَّةُ إِلَى أَنَّ رُكْنَ الْعَقْدِ هُوَ الصِّيغَةُ فَقَطْ، أَمَّا الْعَاقِدَانِ وَ الْمَحَل فَمِمَّا يَسْتَلْزِمُهُ وُجُودُ الصِّيغَةِ، لاَ مِنَ الْأَرْكَانِ، وَ ذَلِكَ لِأَنَّ مَا عَدَا الصِّيغَةَ لَيْسَ جُزْءًا مِنْ حَقِيقَةِ الْعَقْدِ، وَ إِنْ كَانَ يَتَوَقَّفُ وُجُودُهُ عَلَيْهِ .''

(تمام فقہا کا اتفاق ہے اس پر کہ عقد کا وجود نہیں ہوسکتا؛ مگر جبکہ عاقد اور صیغہ (ایجاب وقبول) اور محل موجود ہو جس پر ایجاب وقبول وارد ہوتا ہے یعنی معقود علیہ پایا جائے۔ اور جمہور فقہا اس طرف گئے ہیں کہ یہ تینوں کی تینوں چیزیں عقد کے ارکان ہیں اور حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ رکن تو صرف صیغہ یعنی ایجاب وقبول ہے، باقی عاقدین اور محل عقد تو یہ عقد کے لوازمات میں

سے ہیں، نہ کہ ارکان میں سے اور یہ اس لیے کہ صیغے کے علاوہ دوسری چیزیں حقیقت عقد کا جز نہیں ہیں؛ اگرچہ اس کا وجود اس پر موقوف ہے۔(۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ الکٹرانک بیع میں یہ امور کس حد تک پائے جاتے ہیں تاکہ اس کے جواز اور عدم جواز کا حکم لگایا جاسکے؟

ایجاب وقبول کی حقیقت

مگر پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ایجاب وقبول کی حقیقت کیا ہے؟ حضرات فقہائے کرام نے جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ بیچنے اور خریدنے والے کسی چیز کے خریدنے یا بیچنے کے سلسلے میں جو کلام کرتے ہیں، وہ ایجاب وقبول ہے، اور فقہائے ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ) کے نزدیک ایجاب وہ کلام ہے جو بائع سے صادر ہو اور قبول اس کلام کو کہتے ہیں جو خریدار کی جانب اس کے جواب میں صادر ہو، جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ایجاب اس پہلے کلام کو کہتے ہیں جو اس سلسلے میں رضامندی پر دلالت کرتا ہے، خواہ وہ بائع کی جانب سے صادر ہو یا خریدار کی جانب سے ہو؛ مگر اس اختلاف سے کوئی خاص فرق مسائل پر نہیں پڑتا۔

الغرض ایجاب وقبول وہ کلام ہے جس سے معاملہ (یعنی لین دین) کرنے کے بارے میں متعاقدین کی رضامندی کا علم ہوتا ہے۔

اور فقہا نے یہ تصریح کردی ہے کہ ایجاب وقبول کے لیے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں ہیں؛ بل کہ کسی بھی ایسے لفظ سے یہ بات متحقق ہوجاتی ہے جو تملیک (مالک بنانے) اور تملک (مالک بننے) پر دلالت کرنے والا ہو اور کسی بھی زبان میں اس غرض کو پورا کرتا ہو۔(۲)

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ "فتح القدير" میں لکھتے ہیں:

" وَالْإِيجَابُ لُغَةً: الْإِثْبَاتُ لِأَيِّ شَيْءٍ كَانَ، وَ الْمُرَادُ هُنَا

(۱) الموسوعة الفقهية: ۲۰۰/۳۰

(۲) الدر المختار مع رد المحتار: ۵۱۰/۴

إِثْبَاتُ الْفِعْلِ الْخَاصِّ الدَّالِ عَلَى الرِّضَا الْوَاقِعِ أَوَّلاً . "

(ایجاب لغت میں کسی بھی چیز کے اثبات کو کہتے ہیں اور یہاں مراد ایسے خاص فعل کا اثبات ہے جو رضا پر دلالت کرے اور جو پہلے واقع ہو)(۱)

مزید یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایجاب وقبول میں نطق باللسان بھی لازم نہیں ہے؛ بل کہ اگر ایسا اشارہ کیا جائے جو خرید وفروخت کی نیت وارادے کا پتہ دیتا ہو تو یہ بھی کافی ہے۔ اسی لیے فقہا نے اخرس (گونگے) کے لیے اشارہ کو کافی قرار دیا اور بیع تعاطی (عملی بیع) کو معتبر تسلیم کیا ہے۔

اسی کے پیش نظر علامہ مصطفیٰ الزرقاء رحمہ اللہ نے "المدخل الفقهي العام" میں لکھا ہے:

" إن النطق باللسان ليس حتمياً لظهور الإرادة العقدية بصورة جازمة في النظر الفقهي ؛ بل النطق هو الأصل في البيان و لكن قد تقوم مقامه كل وسيلة اختيارية أو اضطرارية مما يمكن أن يعبر عن الإرادة الجازمة تعبيراً كاملاً مفيداً ، و على هذا فقد رأى الفقهاء أنه يقوم مقام النطق في الإيجاب و القبول إحدى وسائل ثلاث أخرى ، و هي : الكتابة ، و الإشارة من الأخرس ، و التعاطي . "

(بلاشبہ زبان سے بولنا ارادۂ عقد کے ظاہر ہونے کے لیے نظر فقہی میں حتمی ولازمی چیز نہیں ہے؛ بل کہ زبان اظہار کے لیے اصل ہے؛ لیکن کبھی اس کی قائم مقامی ہر وہ اختیاری یا اضطراری وسیلہ وذریعہ کرسکتا ہے جو ارادۂ جازمہ کی کامل وفائدہ بخش تعبیر کرسکے اور اسی بنا پر فقہا کی رائے ہے کہ ایجاب وقبول

(۱) فتح القدير: ۲۴۸/٦

میں نطق کے قائم مقام تین وسائل میں سے ایک ہوسکتا ہے:اور وہ یہ ہیں: کتابت، گونگے کا اشارہ اور عملی خریداری۔)(۱)

اسی طرح دکتور عبدالرزاق السنھوری رحمہ اللہ نے ”نظرية العقد “میں لکھا ہے:

”كما يكون التعبير الصريح بالكلام يكون بالكتابة أيضاً في أي شكل من أشكالها عرفية أو رسمية ، خاصة أو عامة في شكل سند أو خطاب أو نشرة أو إعلان موقعاً عليها أو غير موقع ، مكتوبة باليد أو بالآلة الكاتبة أو بالآلة الطابعة أو بأية طريقة أخرى ، أصلاً كانت أو صورة ، و سواء هذه الصورة مصنوعةً باليد أو مُصوّرةً و سواء كان نقل الكتابة مباشراً أو بطريق التلغراف أو إشارات مصطلح عليها أو بغير ذلك من الطرق ويكون التعبير الصريح بالإشارة كذلك فإشارة الأخرس غير المبهمة تعبير صريح عن إرادته.“

(صریح تعبیر جس طرح کلام سے ہوتی ہے اسی طرح کتابت سے بھی ہوتی ہے خواہ وہ کتابت عرفی یا رسمی ،خصوصی یا عمومی،کسی بھی شکل سے ہو، دستاویز کی شکل میں یا خط کی شکل میں یا اشتہار و اعلان کی شکل میں،جس پر خواہ دستخط ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں،خواہ وہ ہاتھ سے لکھا ہو، یا ٹائپ رائیٹر یا پرنٹر سے یا کسی اور طریقے سے، پھر خواہ وہ اصل ہو یا اس کی فوٹو کاپی ہو، پھر یہ فوٹو کاپی خواہ ہاتھ سے بنائی ہو یا تصویر لی گئی ہو اور خواہ وہ کتابت کی نقل بہ راہ راست ہو یا بطریق ٹیلی گرام یا اصطلاحی اشارات سے ہو یا کسی اور طریقے سے ہو اور اسی طرح صریح تعبیر اشارے سے بھی ہوتی ہے؛لہذا گونگے کا

---

(۱) المدخل الفقهي العام:۱/۴۱۱

اشارہ جو مبہم نہ ہو اس کے دلی ارادے کی صریح تعبیر ہے۔ (۱)

لہذا کتابت ہو یا کوئی اشارہ ہو یا کمپیوٹر، موبائیل، ٹیلیفون، ٹیلکس یا اور کوئی وسیلہ و ذریعہ ہو، وہ سب کے سب بھی ایجاب وقبول کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔

الکٹرانک تجارت میں ایجاب کی صورت

بہ ہر حال جب معلوم ہو گیا کہ ایجاب اور قبول کی حقیقت کیا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ الکٹرانک کاروبار میں ایجاب کس طرح پایا جاتا ہے؟

اس سلسلے میں علمائے عصر کے درمیان رائے کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں دو نقاط نظر ہیں:

پہلا نظریہ

بعض علمائے عصر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بائع کی جانب سے اگر عمومی انداز سے سامان و اشیاء کی پیش کش کر دی جائے اور ان کی قیمتوں کا چارٹ لگا دیا جائے تو یہی دراصل ایجاب کے حکم میں ہے۔ گویا خریداری کی ایک عمومی دعوت ہی کو یہ حضرات ایجاب کے قائم مقام قرار دیتے ہیں۔

شیخ دکتور علی محی الدین القرہ داغی اور شیخ دکتور ابراہیم کافی دونمر کا یہی رجحان ہے، جیسا کہ ان کی ابحاث سے اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ ابراہیم دونمر نے اپنی بحث ''**إجراء العقود بآلات الاتصال الحديثة**'' مندرجہ ''**مجلة الفقه الإسلامي**'' میں لکھا ہے:

> **"ينبغي القول بأن توجيه الإيجاب إلى الجمهور يجوز، و بأن العقد بهذه الطريقة ينعقد. وعلى هذا يجب مثلاً اعتبار عرض البائع سلعته في الواجهة و وضع قائمة الأسعار بإزائها إيجابًا، و يجب القول بانعقاد العقد إذا التقى هذا الإيجاب**

(۱) بحواله: إجراء العقود بوسائل الحديثة: للدكتور محمد عقلة الإبراهيم: ۳۳

بالقبول ممن له أهلية التعاقد .(و على هذا الحكم نصَّتْ التشريعاتُ الحديثة ، نحو الفقرة الأولىٰ من المادة :٨٠من القانون المدني العراقي) ؛ لأن التراضي قد تحقق ؛ ولأن مبادئ الفقه الإسلامي في هذا الموضوع (الرضا ، رفع الحرج ، ومراعاة الاستعمال الشائع أو العرف العادة) تستوجب هذا القول. "

(مناسب بات یہ ہے کہ جمہور کی جانب ایجاب کرنا جائز ہےاور یہ کہ اس سے عقد منعقد ہو جاتا ہے۔اوراس بنا پر لازم ہے کہ بائع کے اپنے سامان کو دکان کے سامنے والے حصے میں رکھنے اوراس کے بالمقابل قیمتوں کی فہرست کے لگادینے کو ایجاب مانا جائے اور یہ ماننا بھی ضروری ہوا کہ جب اس ایجاب سے قبول ایسے شخص کی جانب سے جواس کی اہلیت رکھتا ہو متصل ہو جائے تو یہ عقد منعقد ہو گیا۔)(۱)

اسی طرح شیخ محی الدین القرہ داغی نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔(۲)

اوران حضرات نے مالکیہ کے اس جزئیہ سے استدلال کیا ہے جو علامہ دسوقی نے ''الشرح الکبیر'' کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''وَ أَمَّا لَوْ عَرَضَ رَجُلٌ سِلْعَتَهُ لِلْبَيْعِ وَقَالَ:مَنْ أَتَانِي بِعَشْرَةٍ فَهِيَ لَهُ ، فَأَتَاهُ رَجُلٌ بِذَلِكَ إِنْ سَمِعَ كَلَامَهُ أَوْ بَلَغَهُ فَالْبَيْعُ لَازِمٌ وَلَيْسَ لِلْبَائِعِ مَنْعُهُ ، وَإِنْ لَمْ يَسْمَعْهُ وَلَا بَلَغَهُ ، فَلَا شَيْءَ لَه. ذَكَرَهُ فِي نَوَازِلِ الْبُرْزُلِيِّ ، وَ مِثْلُهُ فِي الْمِعْيَارِ.''

(لیکن اگرایک آدمی نے اپنا سامان بیچنے کے لیے پیش کیا اور کہا کہ جو بھی

(۱) مجلة الفقه الاسلامي:عدد/٦ جلد:٣/٩٨٠

(۲) مجلة الفقه الاسلامی:عدد٦/٣/٩٤٠

میرے پاس دس درہم لے کر آئے گا تو یہ چیز اس کی ہوگی، پس ایک شخص اس کے پاس دس درہم لے کر آیا تو اگر یہ شخص اس کا کلام سنا ہو یا اس کو اس کی بات پہنچی ہو تو یہ بیع لازم ہوگئی اور بائع کو منع کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر اس نے اس کا کلام نہیں سنا تھا اور نہ اس کی بات اس کو پہنچی تھی تو اسے کچھ نہ ملے گا یعنی یہ بیع نہیں ہوئی، اس مسئلے کو برزلی نے اپنی ''نوازل'' میں ذکر کیا ہے اور اسی جیسی بات معیار کتاب میں بھی ہے۔)(۱)

اس میں خطاب خاص کی جگہ خطاب عام ہے جو ہر کسی کے لیے عام ہے، اس کو ایجاب مان کر بائع کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ قبول کے واقع ہونے کے بعد اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔

دوسرا نظریہ

اس سلسلے میں دوسرا نظریہ جس کو اکثر حضرات نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ محض اعلان و دعوت سے ایجاب متحقق نہیں ہوتا؛ کیوں کہ فقہا نے جو لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی خریداری کی دعوت وترغیب الگ چیز ہے اور ایجاب الگ چیز ہے، ایجاب تو کسی خاص شخص یا مخصوص لوگوں سے خطاب سے متحقق ہوتا ہے، لہذا صرف اس قدر بات سے کہ کوئی کمپنی اپنی اشیاء کا اعلان و دعوت دے اور اس کی تفصیلات بیان کر دے، ایجاب متحقق نہیں ہوتا؛ الاَّ یہ کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی صورت پائی جائے جس سے بائع کا انشاء عقد کا ارادہ معلوم ہوتا ہو۔

جمہور علماء کے نظریہ کی وضاحت

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک یہاں دو الگ الگ صورتیں ہیں: ایک یہ کہ بائع کی جانب سے اشیاء و سامان کی پیشکش اور ان کی تفصیلات کو ویب سائیٹ پر ڈالنے سے محض اعلان وترغیب مقصود ہو، اس صورت میں تو یہ جمہور علما کے نزدیک ایجاب نہیں کہلائے گا اور

---

(۱) حاشية الدسوقي على الشرح الكبير:۴/۳

دوسری صورت یہ ہے کہ اس پیشکش اور اعلان سے انشاء عقد (یعنی معاملہ کرنا) ہی اس کا مقصود ہو کہ اگر کوئی بھی اس اعلان ودعوت پر آئے اور اس کو قبول کرلے تو وہ محض اسی اعلان کی بنیاد پر فروخت کردینا چاہتا ہو، اس صورت میں یہ پیشکش اور اعلان ''ایجاب'' کے حکم میں ہوگا۔

اور حضرات فقہا مالکیہ کے یہاں جو یہ جزئیہ ملتا ہے کہ دعوت عامہ بھی ایجاب کے حکم میں ہے، غالباً اس سے ایسی ہی صورت مراد ہے۔ لہذا جہاں انشاء عقد کا مقصود ہونا ظاہر ہو، اس میں اعلان عام کو بھی ایجاب سمجھا جاسکتا ہے۔

جیسے کہ الکٹرانک تجارت میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ بائع کی جانب سے جو اعلان ہوتا ہے، اس کا مقصود ہی انشاء عقد معلوم ہوتا ہے، لہذا ہمارے نزدیک انٹرنیٹ پر دی ہوئی تفصیلات بھی ایجاب ہی کے حکم میں ہیں؛ کیوں کہ یہاں ظاہر یہی ہے۔

الکٹرانک تجارت میں قبول کی صورت

اب رہا یہ کہ ''الکٹرانک کاروبار'' میں قبول کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس بارے میں اولاً یہ بات ذہن میں ہونا چاہیے کہ الکٹرانک کاروبار دراصل دوغائبین میں کاروبار ہے، لہذا جب ایجاب کے بعد کسی بھی ذریعے سے دوسرا فریق اپنا قبول ظاہر کردے گا، بیع ہوجائے گی جیسے کتابت کے ذریعے بیع کا حکم ہے۔

لہذا یہاں اگر خریدار اپنی رضا کا اظہار اور قبولیت کا پیغام خط سے یا ای میل سے یا فون سے یا ٹیلکس سے یا موبائیل فون سے ظاہر کردے گا تو وہ قبول شمار ہوجائے گا۔

اسی طرح اگر ویب سائیٹ پر جاکر اپنی پسندیدہ چیز کی خریداری کے لیے قبول پر کلک کردے گا تو وہ بھی قبول شمار ہوگا۔

شیخ محمد بن جبر الالفی (استاذ فقہ، المعہد العالی للقضاء، الریاض) نے اپنی کتاب ''التعاقد الإلكتروني في ميزان الشرع الإسلامي'' میں لکھا ہے:

''و القبول يتم بأية طريقة جرى العرف على اعتبارها قبولاً،

کـاللفظ أو الإشـارة ، أو الـكتـابة ، أو الرمز (الـضـغط على زر يحمل علامة معينة)، أو الـقبول الضمني بإدخال الرقم السري لبـطـاقة الائتـمـان. إذا اقترن هذا القبول بالإيجاب انعقد العقد بيـن الـطـرفيـن ، و تـرتبـت عـليه آثاره من التزام البائع بتسليم المبيع ، و التزام المشترى بدفع الثمن.‘‘

(قبول مکمل ہو جاتا ہے کسی بھی ایسے طریقے سے جو عرف میں قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے، جیسے لفظ یا اشارہ یا کتابت یا رمز یعنی ایسے نشان پر کلک کرنا جو متعین علامت کا حامل ہو، یا ضمنی قبول سے اس طرح کہ کریڈیٹ کارڈ کا مخفی نمبر داخل کیا جائے۔ جب یہ قبول ایجاب سے متصل ہو جائے تو طرفین میں عقد منعقد ہو جائے گا اور اس پر عقد کے آثار جیسے بائع پر مبیع کی سپردگی اور خریدار پر ثمن کی ادائیگی، مرتب ہو جائیں گے۔)(۱)

البتہ یہاں ایک بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ بعض ویب سائیٹوں میں معاملہ کا انعقاد ایک سے دو بار بٹن پر کلک کرنے کے بعد معتبر مانا جاتا ہے، ایسے سائیٹوں پر ایک بار بٹن پر کلک کرنے کے بعد دوبارہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا آپ اس معاملے سے مطمئن ہیں؟ جب دوبارہ بھی آپ اس پر کلک کرتے ہیں تو وہ معاملہ منعقد مانا جاتا ہے۔ اس قسم کے ویب سائیٹوں پر ’’قبول‘‘ دوبار کلک کرنے کی صورت میں مانا جائے گا۔

اور بعض ویب ایسے ہوتے ہیں جن میں صرف ایک ہی بار بٹن کلک کرنے کو کافی سمجھا جاتا ہے، اس قسم کے ویب پر صرف ایک بار کلک کرنا ہی قبول مانا جائے گا۔

تیسرا اصول - ایجاب وقبول میں اتصال

عقد بیع کے اصول وضوابط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایجاب وقبول میں اتصال پایا جائے کہ ایک جانب سے ایجاب ہو اور دوسری جانب سے علی الفور اس کو قبول کیا جائے۔

(۱) التعاقد الإلكتروني:۷

حضرات فقہا کے یہاں اس کو خیارِ مجلس سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب کے بعد قبول اسی مجلس میں ہو جانا چاہیے، اگر اسی مجلس میں قبول نہ کیا تو وہ عقد منعقد نہیں ہوا اور اگر مجلس ہی میں قبول کر لیا تو عقد لازم ہو گیا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ فقہاء نے صحت عقد کے لیے اتحادِ مجلس عقد کی شرط لگائی ہے اور یہ کہا ہے کہ ایک ہی مجلس میں ایجاب وقبول دونوں کا پایا جانا ضروری ہے، اور اس شرط پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ "بدائع الصنائع" میں لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا الَّذِي يَرْجِعُ إِلَى مَكَانِ الْعَقْدِ فَوَاحِدٌ وَ هُوَ اتِّحَادُ الْمَجْلِسِ بِأَنْ كَانَ الْإِيجَابُ وَالْقَبُولُ فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ ، فَإِنِ اخْتَلَفَ الْمَجْلِسُ لَا يَنْعَقِدُ حَتَّى لَوْ أَوْجَبَ أَحَدُهُمَا الْبَيْعَ فَقَامَ الْآخَرُ عَنِ الْمَجْلِسِ قَبْلَ الْقَبُولِ أَوْ اشْتَغَلَ بِعَمَلٍ آخَرَ يُوجِبُ اخْتِلَافَ الْمَجْلِسِ ثُمَّ قَبِلَ لَا يَنْعَقِدُ."

(اور رہی وہ شرط جو جائے عقد کی طرف لوٹتی ہے، تو وہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اتحاد مجلس اس طرح کہ ایجاب اور قبول دونوں ایک ہی جگہ واقع ہوں، پس اگر مجلس مختلف ہو جائے تو عقد منعقد نہ ہوگا؛ یہاں تک کہ اگر ایک نے بیع کا ایجاب کیا اور دوسرا قبول کرنے سے پہلے مجلس سے کھڑا ہو گیا یا کسی دوسرے کام میں مشغول ہو گیا جو اختلاف مجلس کا موجب ہو پھر قبول کرے تو یہ عقد منعقد نہ ہوگا۔(۱)

اور "الفتاوى الهندية" میں ہے:

"و منها أن يكون الإيجاب و القبول في مجلس واحد ؛ حتى لا يختلف المجلس بأن كانا حاضرين ، فأوجب أحدهما ،

(۱) بدائع الصنائع: ۳۲۶/۴

فقام الآخر عن المجلس قبل القبول أو اشتغل بعمل يوجب اختلاف المجلس ، بطل العقد."

(انہی شرطوں میں سے ایک ایجاب وقبول کا ایک مجلس میں ہونا ہے؛ تاکہ مجلس مختلف نہ ہو، اس طرح کہ دونوں (عاقدین) حاضر ہوں اور ان میں سے ایک ایجاب کرے اور دوسرا قبول کرنے سے پہلے مجلس سے اٹھ جائے یا کسی ایسے کام میں مشغول ہوجائے جو اختلاف مجلس کا سبب ہو تو عقد باطل ہوجائے گا۔)(۱)

اتصال ایجاب وقبول کی دوصورتیں

اور پھر ایجاب وقبول میں اتصال دوقسم پر ہے:

(۱) ایک یہ کہ عقد کرنے والے دونوں فریق مجلس میں حاضر ہوں اور ایک جانب سے ایجاب کے فوری بعد اسی مجلس میں دوسرا فریق اس کو قبول کرلے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ خرید نے بیچنے والے دونوں فریق ایک ہی مجلس میں موجود نہ ہوں تو اتصال کی صورت یہ ہے کہ جب دوسرے فریق کو ایجاب غائبانہ طور پر پہنچے جیسے کسی شخص کے ذریعے یا خط سے پہنچے تو وہ اسی وقت اس کو قبول کرلے اور کہہ دے کہ میں نے قبول کیا، یا میں نے خریدلیا، یا اس کا جواب خط کے ذریعے دیدے۔

"البحر الرائق" میں "هداية" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

" وَ الْكِتَابُ كَالْخِطَابِ ، وَكَذَا الْإِرْسَالُ حَتَّى اعْتُبِرَ مَجْلِسُ بُلُوغِ الْكِتَابِ وَأَدَاءِ الرِّسَالَةِ. وَصُورَةُ الْكِتَابِ أَنْ يَكْتُبَ: أَمَّا بَعْدُ ! فَقَدْ بِعْت عَبْدِي فُلَانًا مِنْك بِكَذَا ، فَلَمَّا بَلَغَهُ الْكِتَابُ قَالَ فِي مَجْلِسِهِ ذَلِكَ: اشْتَرَيْتُ ، تَمَّ الْبَيْعُ بَيْنَهُمَا. وَ صُورَةُ

(۱) الفتاوى الهندية: ۲۶۹/۱

الْـإِرْسَـالِ أَنْ يُـرْسِـلَ رَسُـولًا فَيَـقُـولُ الْبَائِعُ: بِعْتُ هَذَا مِنْ فُلَانٍ الْغَائِبِ بِأَلْفِ دِرْهَمٍ ، فَاذْهَبْ يَا فُلَانُ ، فَقُلْ لَهُ ، فَذَهَبَ الرَّسُولُ، فَأَخْبَرَهُ بِمَا قَالَ ، فَقَبِلَ الْمُشْتَرِى فِي مَجْلِسِهِ ذَلِکَ. "

(خط بھی خطاب کے مثل ہے اور اسی طرح کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا بھی، یہاں تک کہ خط کے پہنچنے اور پیغام رسانی کی مجلس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور خط کی صورت یہ ہے کہ یہ لکھدے کہ اما بعد: میں نے میرے غلام فلاں کو اتنے میں آپ کے ہاتھ بیچ دیا، پس جب وہ خط اس کو پہنچا اور اس نے اسی مجلس میں کہہ دیا کہ میں نے یہ خرید لیا، تو یہ بیع اس دونوں کے مابین مکمل ہوگئی اور پیغام بھیجنے کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو قاصد بنا کر بھیجے اور بائع کہے کہ میں نے یہ فلاں غائب شخص کے ہاتھ ایک ہزار درہم میں بیچ دیا ہے، لہذا تم جاؤ اور اس کو سنادو، پس یہ شخص جائے اور اس کو یہ خبر سنادے اور خریدار اسی مجلس میں اس کو قبول کرلے۔)(۱)

اسی طرح ''درر الحكام شرح مجلة الأحكام میں'' ہے:

''(وَالْكِتَابُ وَالرِّسَالَةُ كَالْخِطَابِ) يَعْنِي إذَا كَتَبَ: أَمَّا بَعْدُ ، فَقَدْ بِعْتُک عَبْدِی فُلَانًا بِكَذَا ، أَوْ قَالَ لِرَسُولِهِ: بِعْتُ هَذَا مِنْ فُلَانٍ الْغَائِبِ بِكَذَا ، فَاذْهَبْ وَ أَخْبِرْهُ ، فَوَصَلَ الْكِتَابُ إلَى الْمَكْتُوبِ إلَيْهِ ، وَ أَخْبَرَ الرَّسُولُ الْمُرْسَلَ إلَيْهِ ، فَقَالَ فِي مَجْلِسِ بُلُوغِ الْكِتَابِ أَوْ الرِّسَالَةِ: اشْتَرَيْتُهُ بِهِ ، أَوْ قَبِلْتُهُ ، تَمَّ الْبَيْعُ بَيْنَهُمَا؛ لِأَنَّ الْكِتَابَ مِنْ الْغَائِبِ كَالْخِطَابِ مِنْ الْحَاضِرِ، وَ الرَّسُولُ مُعَبِّرٌ وَسَفِيرٌ فَكَلَامُهُ كَكَلَامِ الْمُرْسِلِ.''

(۱) البحر الرائق:۵/۲۹۰

(خط اور پیغام بھیجنا خطاب کرنے کی طرح ہے، یعنی جب وہ لکھدے کہ امابعد: میں نے میرا فلاں غلام آپ کو اتنے میں بیچ دیا یا اپنے قاصد سے کہے کہ میں نے فلاں غائب شخص کو یہ اتنے میں بیچ دیا؛ لہذا جا کر اس کو خبر کردے، پس وہ خط مکتوب الیہ تک پہنچ جائے اور قاصد مرسل الیہ تک خبر پہنچا دے اور وہ خط پہنچنے یا پیغام پہنچنے کی مجلس میں کہدے کہ میں نے خرید لیا یا قبول کر لیا تو بیع مکمل ہوگئی؛ کیوں کہ غائب کی جانب سے خط حاضر سے خطاب کی طرح ہے اور قاصد اسی کی بات کہنے والا اور سفیر ہے، لہذا اس کا کلام بھیجنے والے کے کلام کی طرح ہے۔)(۱)

الکٹرانک کاروبار میں اتحاد مجلس کی صورت

جب یہ معلوم ہوا کہ عقد کی صحت کے لیے یہ لازم ہے کہ ایجاب کے بعد قبول پایا جائے اور ان میں اتصال ہو، تو اسی کے مطابق الکٹرانک تجارت میں بھی اگر قبول کرنے والے نے مجلس میں قبول کر لیا تو وہ عقد لازم ہو گیا، ورنہ لازم نہیں ہوا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں تو کوئی مجلس حسی طور پر نہیں ہوتی جیسا کہ ظاہر ہے، تو مجلس کا کیا مطلب ہوگا؟

اس سلسلے میں اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ مجلس سے مراد کوئی حسی مجلس ہونا ضروری نہیں؛ بل کہ دو غائب لوگوں کا معاملہ بھی جائز مانا گیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا؛ لہذا مجلس سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ایک فریق کی دوسرے فریق سے بات جاری ہو، خواہ وہ بات بالمشافہہ ہو یا کتابت وغیرہ سے ہو، اس لیے یہاں بھی فون سے یا ویب پر جب معاملہ کرنا چاہے تو اس وقت منظوری کے بٹن پر کلک کرنا بھی مجلس ہی کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ فقہا کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجلس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی مقام پر جمع ہوں، بل کہ بعض صورتوں میں دونوں دو الگ الگ مقامات پر رہتے ہوئے بھی اتحاد مجلس کا تصور ہو

(۱) درر الحکام:۶/۱۵۵

سکتا ہے، جیسے فقہا نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی نے خط سے ایجاب کیا تو جب وہ خط دوسرے فریق کو پہنچے اور وہ اسی مجلس میں قبول کر لے تو وہ بھی اتحاد مجلس ہی ہے؛ حالاں کہ یہاں دونوں الگ الگ مقامات پر ہیں؛ وجہ یہ ہے کہ اگر دونوں ایک ہی مقام پر جمع ہوں تو یہ حقیقی اتحاد مجلس ہے اور دوسری صورت حکمی اتحاد مجلس کی ہے۔

اتحاد مجلس سے مراد زمانۂ عقد ہے

لہذا بعض فقہا نے اس سے یہ اخذ کیا کہ اتحادِ مجلس سے مراد یہ نہیں کہ حسی طور پر ایک جگہ دونوں فریق جمع ہوں، بل کہ اس سے مراد وہ وقت و زمانہ ہے جس میں طرفین کی اس سلسلے میں بات چیت جاری رہے۔

اسی لیے علامہ مصطفیٰ الزرقاء کی رائے یہ ہے کہ مجلس عقد سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں کاروباری بات چیت و معاملہ چلتا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''شرح القانون المدني السوري'' میں لکھتے ہیں:

''المدة الزمنية التي تكون بعد الإيجاب، والطرفان مقبلان على التعاقد دون إعراض من أحدهما''

(مجلس عقد وہ زمانی مدت ہے، جو ایجاب کے بعد ہوتی ہے، جب کہ طرفین معاملہ کرنے کی جانب بغیر اعراض کے متوجہ و مائل ہوتے ہیں۔)(۱)

اور اسی کو فضیلۃ الشیخ وھبہ الزحیلی نے بھی اختیار کیا ہے، چناں چہ انھوں نے اولاً شیخ الزرقاء کی رائے نقل کی ہے اور پھر اسی کو لیا ہے۔(۲)

اسی طرح علمائے قانون میں سے شیخ عبدالرزاق السنہوری نے ''الوسيط في شرح القانون المدني'' میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

(۱) بحواله: إجراء العقود بوسائل الحديثة: ۴۹

(۲) مجلة الفقه الإسلامي: عدد: ۶/۲/۸۸۷

" هو المكان الذي يضم المتعاقدين ، وليس الملحوظ فيه المعنى المادي للمكان ؛ بل الملحوظ فيه هو الوقت الذي يبقى فيه المتعاقدان مشغولين بالتعاقد دون أن يصرفهما عن ذلك شاغل آخر."

(مجلس وہ مکان ہے جو متعاقدین کو جمع کرے؛ لیکن اس میں مکان کا مادی مفہوم ملحوظ نہیں ہے؛ بل کہ اس میں ملحوظ وہ وقت ہے جس میں متعاقدین معاملہ کرنے میں اس طرح مشغول رہیں کہ کوئی دوسرا شغل اس سے ان کو نہ پھیرے۔)(۱)

لہذا "الکٹرانک بیع وشراء" میں قبول کے لیے مجلس عقد وہ زمانہ ہے جس میں دونوں فریق معاملے کی جانب متوجہ ہیں، لہذا جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، اس وقت تک قبول کر لینے کی گنجائش ہوگی اور جب یہ لوگ معاملہ چھوڑ کر بات ختم کر دیں گے تو مجلس بھی ختم سمجھی جائے گی۔

اس سلسلے میں ایک اشکال کا حل

مگر "الکٹرانک کاروبار" میں اس سلسلے میں ایک پیچیدگی آتی ہے، وہ یہ کہ بعض معاملات میں ایجاب وقبول ایک ہی زمانے میں بھی متحقق نہیں ہو سکتے؛ بل کہ اس سلسلے میں ممکن ہے کہ ایجاب کے بعد دوسرا فریق اس کو قبول کرنے میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کا فصل کر دے۔ مثلاً ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز خریدنی تھی، بائع نے ایجاب کیا اور اس کا جواب دینے کے لیے چند گھنٹوں یا دنوں کا وقت بھی دیا تو قبول کرنے والا علی الفور قبول نہیں کرتا؛ بل کہ غور وفکر کے بعد کسی دوسری مجلس میں اس کو قبول کرتا ہے۔

اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع قبول کرنے کی کوئی مدت متعین نہیں کرتا؛ بل کہ صرف ایجاب کرتا ہے، یعنی بیچنے کی نیت سے سامان وغیرہ پیش کرتا اور ان کی قیمت بتاتا ہے

(۱) الوسيط في شرح القانون المدني للشيخ السنهوري:۲۱۴/۱

اور دوسرا فریق بعد التامل اور غور وفکر کے بعد اس کو قبول کرتا ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں قبول اسی زمانے میں متحقق نہیں ہوتا جو بائع کے ایجاب کا زمانہ ہے؛ بل کہ اس کے بعد حسب صواب دید کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی قبول متحقق ہوتا ہے؛ کیوں کہ بسا اوقات آدمی کو غور وفکر کے لیے وقت فرصت کا انتظار ہوتا ہے اور وہ علی الفور میسر نہیں آتا، اس لیے وہ بعد میں اس پر توجہ دیتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں یہ الکٹرانک تجارت جائز ہوگی؟

اس سلسلے میں بعض فقہا کہتے ہیں کہ طرفین کے مجلس میں حاضر ہونے کی صورت میں تو یہ بات چل جاتی ہے کہ مجلس میں ایجاب وقبول ہو جائے؛ لیکن طرفین کے غائب ہونے کی صورت میں یہاں مشکلات پیش آتی ہیں، لہذا طرفین کے غائب ہونے کی صورت میں مجلس صرف اسی قدر زمانے کو قرار دینا جس میں طرفین معاملہ کریں، صعوبت کا باعث ہے، اس لیے ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ مجلس اس زمانے کے بعد بھی باقی سمجھی جانی چاہیے، جس میں فریقین معاملے کے بارے میں گفتگو میں مشغول ہیں اور مجلس اس وقت تک تسلیم کی جانی چاہیے، جس کو عرف میں اتحاد سمجھا جائے۔ ہاں اگر اس قدر تاخیر کیا کہ عرفِ تجار میں اس کو اعراض سمجھا جاتا ہو تو اس کو قابل لحاظ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

اس رائے کے حاملین نے شیخ الاسلام خواہر زادہ کی مبسوط کے حوالے سے ان کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے، جس میں خطاب اور کتاب کے مابین اتحاد مجلس کے بارے میں فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور خطاب کی صورت میں تو علی الفور قبول کو لازم کہا گیا ہے؛ جب کہ خط وکتاب کی صورت میں گنجائش دی گئی ہے۔

شیخ الاسلام خواہر زادہ کی عبارت شامی اور ابن نجیم نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے:

" وَذَكَرَ شَيْخُ الْإِسْلَامِ خُوَاهَرْ زَادَهْ فِي مَبْسُوطِهِ: الْكِتَابُ وَالْخِطَابُ سَوَاءٌ إِلَّا فِي فَصْلٍ وَاحِدٍ، وَهُوَ أَنَّهُ لَوْ كَانَ حَاضِرًا

فَخَاطَبَهَا بِالنِّكَاحِ ، فَلَمْ تُجِبْ فِي مَجْلِسِ الْخِطَابِ، ثُمَّ أَجَابَتْ فِي مَجْلِسٍ آخَرَ ، فَإِنَّ النِّكَاحَ لا يَصِحُّ ، وَفِي الْكِتَابِ إِذَا بَلَغَهَا وَقَرَأَتْ الْكِتَابَ وَلَمْ تُزَوِّجْ نَفْسَهَا مِنْهُ فِي الْمَجْلِسِ الَّذِي قَرَأَتْ الْكِتَابَ فِيهِ ، ثُمَّ زَوَّجَتْ نَفْسَهَا فِي مَجْلِسٍ آخَرَ بَيْنَ يَدَيِ الشُّهُودِ ، وَقَدْ سَمِعُوا كَلَامَهَا وَمَا فِي الْكِتَابِ يَصِحُّ النِّكَاحُ ؛ لِأَنَّ الْغَائِبَ إِنَّمَا صَارَ خَاطِبًا لَهَا بِالْكِتَابِ ، وَالْكِتَابُ بَاقٍ فِي الْمَجْلِسِ الثَّانِي فَصَارَ بَقَاءُ الْكِتَابِ فِي مَجْلِسِهِ ، وَقَدْ سَمِعَ الشُّهُودُ مَا فِيهِ فِي الْمَجْلِسِ الثَّانِي بِمَنْزِلَةِ مَا لَوْ تَكَرَّرَ الْخِطَابُ مِنْ الْحَاضِرِ فِي مَجْلِسٍ آخَرَ ، فَأَمَّا إِذَا كَانَ حَاضِرًا فَإِنَّمَا صَارَ خَاطِبًا لَهَا بِالْكَلَامِ ، وَ مَا وُجِدَ مِنْ الْكَلَامِ لا يَبْقَى إِلَى الْمَجْلِسِ الثَّانِي ، وَ إِنَّمَا سَمِعَ الشُّهُودُ فِي الْمَجْلِسِ الثَّانِي أَحَدَ شَطْرَيِ الْعَقْدِ.''

(شیخ الاسلام خواہرزادہ نے اپنی ''مبسوط'' میں ذکر کیا ہے کہ خط اور خطاب دونوں برابر ہیں، سوائے ایک صورت کے اور وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص حاضر تھا اور اس نے عورت کو نکاح کا پیغام دیا، لیکن اس نے مجلس میں اس کو قبول نہیں کیا، پھر کسی دوسری مجلس میں اس نے قبول کیا، تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوا اور خط کی صورت میں جب خط عورت کو پہنچا اور اس نے اس کو پڑھا؛ لیکن اسی مجلس میں جس میں اس نے خط پڑھا تھا، اس آدمی سے اس نے شادی نہیں کی، پھر دوسری مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں اس نے اپنا نکاح اس شخص سے کر لیا اور ان گواہوں نے اس عورت کا کلام اور خط کا مضمون سن لیا تو یہ نکاح صحیح ہو گیا؛ کیوں کہ غائب شخص نے عورت کو پیغام خط سے دیا ہے اور خط دوسری

مجلس تک بھی باقی ہے؛لہذا خط کا دوسری مجلس تک باقی رہنا جبکہ گواہوں نے اس خط کا مضمون دوسری مجلس میں سن لیا ہو، یہ ایسا ہے جیسے حاضر شخص کی جانب سے مجلس میں دوسری مرتبہ خطاب کیا گیا ہو؛لیکن اگر یہ پیغام دینے والا حاضر ہوتو یہ عورت کو اپنے کلام سے پیغام دینے والا ہے اور یہ کلام دوسری مجلس تک باقی نہیں رہتا اور گواہ جو قبول والا کلام سنتے ہیں وہ عقد کا ایک حصہ ہے۔(۱)

حاصل اس کا یہ ہے کہ خط کی صورت میں خط پہنچنے کی مجلس ہی میں پیغام نکاح کو قبول کرنا ضروری نہیں ؛بل کہ دوسری مجلس میں جہاں گواہ موجود ہوں اور وہ لوگ خط کا مضمون جو کہ ایجاب ہے اور عورت کا قبول دونوں کو سنیں تو یہ بھی جائز ہے اور اس سے نکاح ہو جا تا ہے، کیوں کہ خط جب دوسری مجلس تک باقی ہے تو اس کو یوں سمجھا جائے گا کہ یہ ایسا ہے جیسے کسی حاضرِ مجلس نے پیغام نکاح دیا اور عورت نے اول وہلے میں اس کو قبول نہیں کیا، بل کہ اعراض کیا؛ مگر پیغام دینے والے نے دوبارہ پیغام دیا اور عورت نے اس دوسری دفعہ کے پیغام کو قبول کرلیا،تو یہ نکاح صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطاب اور خط اگر چہ کہ اکثر مسائل میں برابر ہیں ؛مگر اس بارے میں ان دونوں میں فرق ہے، کہ خطاب میں تو اسی وقت قبول کر لینا لازم ہے ؛لیکن خط کی صورت میں دوسری مجلس میں قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

اگر چہ کہ علامہ خواہر زادہ کی اس بات کو علامہ ابن عابدین شامی نے ظاہر الروایۃ کے خلاف قرار دیا ہے، تاہم بعض علما نے اس کو موجودہ حالات کے تناظر میں راجح سمجھا ہے۔

چناں چہ شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی نے بھی اسی کو موجودہ دور کے حالات کے لحاظ سے راجح قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں :

''اور بالخصوص موجودہ حالات میں لوگوں کے تعامل کا طریق دیکھتے

---

(۱) شامی:۵۱۳/۴، البحر الرائق:۲۹۱/۵

ہوئے ، یہی موقف اسلم معلوم ہوتا ہے ؛ کیوں کہ قدیم دور میں خط ایک شخص لے کر مکتوب الیہ تک جاتا اور اس کو پہنچا تا تھا اور اکثر حالات میں اس کا جواب لے کر خط لکھنے والے کو دے دیتا تھا ؛ لیکن ہمارے اس دور میں خط پوسٹ سے جاتا ہے یا ٹیلکس سے یا فیاکس سے اور یہاں ان صورتوں میں کوئی اس خط کو لیجانے والا نہیں ہوتا ، جو جواب کا انتظار کر لے اور جواب لیتا آئے ، اسی لیے شیخ الاسلام خواہرزادہ کا موقف ہی عملی موقف ہے اور جب تک کسی نص قرآن وسنت سے تضاد وتصادم نہ ہو ، اس موقف کو اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں ۔(۱)

اسی رائے کو بعض علمائے عرب جیسے شیخ علی الخفیف نے اختیار کیا ہے اور انہی کی اتباع میں شیخ ابراہیم کافی دونمز نے بھی لیا ہے ۔(۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ الکٹرانک کاروبار میں ایک جانب سے ایجاب کے بعد دوسری جانب سے قبول اسی وقت ہو جانا لازم نہیں ؛ بل کہ غور وفکر کرنے کے بعد کسی اور وقت بھی اپنے قبول کا اظہار واعلان کر سکتا ہے ۔

اتحاد مجلس کا معیار کیا ہوگا ؟

پھر اگر موجب (ایجاب کرنے والے) نے قبول کی کوئی مدت مقرر کی ہو تو اس مدت تک قبول کو معتبر مانا جائے گا اور جب وہ مدت ختم ہو جائے گی تو اب قبول کرنے کا حق نہ ہوگا ۔

اور اگر موجب نے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے تو مدت کی تحدید عرف کی بنا پر کی جائے گی ؛ کیوں کہ اگر کوئی مدت ہی مقرر نہ کی جائے اور یہ کہا جائے کہ قبول کرنے والا ایجاب کے بعد کبھی بھی قبول کا اعلان کر سکتا ہے تو اس میں دوسرے فریق کا ضرر عظیم ہے ، لہذا ظاہر یہ ہے

---

(۱) فقه البيوع: ۱/۴۸-۴۸

(۲) دیکھو: مجلة الفقه الإسلامي : عدد: ۶/۲/۱۰۰۶

کہ اس کو عرفِ تجار کے حوالے کیا جائے۔

شیخ ماجد محمد سلیمان اباالخیل نے اپنی کتاب "العقد الإلكتروني" میں لکھا ہے:

" أما إذا كان التعاقد غير مباشر أي غير لحظي ، فإن مجلس العقد يبدأ من لحظة اطلاع القابل على المعروض عليه، سواء كان منتج أو خدمة و يستمر حتى تنتهي المدة المحددة إن وجدت ،وإلا رجع في ذلك إلى الأعراف."

(لیکن اگر معاملہ مباشر نہ ہو یعنی علی الفور نہ ہو تو مجلس عقد شروع ہوگی اس وقت سے جب کہ قبول کرنے والا اس پر پیش کی گئی چیز پر مطلع ہو خواہ وہ کوئی تیار کردہ چیز ہو یا کوئی خدمت یعنی سرویس ہو اور یہ مدت برقرار رہے گی اس مدت تک جو مقرر کی گئی ہو اگر اس کے لیے کوئی مدت مقرر ہو، ورنہ اس سلسلے میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا۔)(۱)

مگر آپ کا خیال یہ ہے کہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی عرف قائم نہیں ہوسکا ہے۔

اور حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی نے "فقہ البیوع" میں اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے امام قرافی اور امام نووی کی عبارات سے یہ دکھایا ہے کہ بعض فقہا کے نزدیک قبول کی مدت طویل ہونے اور قصیر ہونے میں فرق کیا گیا ہے، اگر طویل مدت تک قبول نہ کیا تو اس کا حق ساقط ہوجائے گا اور اگر مختصر مدت تک سکوت کیا تو اس کا حق ساقط نہ ہوگا۔

پھر اخیر میں وہ لکھتے ہیں:

" و إن هذه المدة المتعارفة يمكن أن تختلف من مبيع إلى آخر. فمدة القبول في المبيعات التي يتسارع إليها الفساد ، كالفواكه الطازجة و الخضراوات و البقول أقل بالنسبة إلى

(۱) العقد الإلكتروني:۶۳

المبيعات التي لا تفسد بسرعة وتكون مدة القبول في المبيعات الضخمة والكميات الكبيرة أكثر من المبيعات العادية ؛ والعمدة في ذلک هو العرف الذي يلجأ إليه القضاء."

(یہ مدت متعارفہ ممکن ہے کہ ایک قسم کی مبیع سے دوسری قسم کی مبیع میں مختلف ہو، پس وہ مبیع جس میں جلدی سے فساد وخرابی آجاتی ہے جیسے تازہ پھل اور سبزیاں تو ان کی مدت قبول ایسے مبیع کی بہ نسبت کم ہوگی جن میں جلدی سے خرابی نہیں آتی اور بڑی بڑی چیزوں اور بڑی مقدار کی چیزوں کی مدت قبول عام قسم کی چیزوں کے لحاظ سے زیادہ ہوگی۔اور اس بارے میں اعتماد عرف پر ہوگا جس کی جانب قضاء میں رجوع کیا جاتا ہے۔)(۱)

احقر کی بھی یہی رائے ہے کہ اس مسئلے کا مدار عرف پر ہونا چاہئے ، چناں چہ متعدد فقہائے کرام نے وضاحت کی ہے کہ مجلس کے بدل جانے اور عاقدین کے جدا ہونے کے سلسلے میں مدار عرف ہے۔

علامہ شمس الدین ابن قدامہ الحنبلی نے "الشرح الکبیر"میں لکھا ہے:

" و المرجع في التفرق إلى عرف الناس و عاداتهم ؛ لأن الشارع علیہ السلام علّق عليه حكماً ، و لم يبينه ، فدلَّ على أنه أراد ما يعرفه الناس كالقبض و الإحراز."

(عاقدین کے جدا ہونے میں مرجع لوگوں کا عرف اور عادت ہے ؛ کیوں کہ شارع علیہ السلام نے جدا ہونے پر حکم کو معلق کیا؛ مگر اس کی وضاحت نہیں بیان کی ،اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا مقصد اس سے وہ چیز ہے جو لوگوں میں معروف ہو،جس طرح قبض اور احراز میں عرف کا لحاظ ہے۔)(۲)

---

(۱) فقه البيوع:۱/۵۵-۵۶

(۲) الشرح الكبير:۴/۶۳

اسی طرح علامہ موفق الدین بن قدامہ نے ''المغني'' میں لکھا ہے:

''وَالْمَرْجِعُ فِي التَّفَرُّقِ إِلَى عُرْفِ النَّاسِ وَعَادَتِهِمْ، فِيمَا يَعُدُّونَهُ تَفَرُّقًا؛ لِأَنَّ الشَّارِعَ عَلَّقَ عَلَيْهِ حُكْمًا، وَلَمْ يُبَيِّنْهُ، فَدَلَّ ذَلِكَ عَلَى أَنَّهُ أَرَادَ مَا يَعْرِفُهُ النَّاسُ، كَالْقَبْضِ، وَالْإِحْرَازِ.''

(عاقدین کے جدا ہونے میں مرجع لوگوں کا عرف اور عادت ہے، ان امور میں کہ وہ اس کو جدائی شمار کرتے ہیں؛ کیوں کہ شارع علیہ السلام نے جدا ہونے پر حکم کو معلق کیا؛ مگر اس کی وضاحت نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا مقصد اس سے وہ چیز ہے جو لوگوں میں معروف ہو، جس طرح قبض اور احراز میں عرف کا لحاظ ہے۔)(۱)

اسی طرح المبدع اور شرح الزرکشی وغیرہ میں بھی ہے۔(۲)

اور عرف ہی سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مبیع کی الگ الگ نوعیت وحیثیت کی وجہ سے ان کی مدت قبول بھی مختلف ہو جاتی ہے۔

چوتھا اصول-قبولیت کا علم

اس ضمن میں یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قبول کرنے والے کے قبول کر لینے کا علم دوسرے فریق کو ہونا ضروری ہے۔؟

اس حوالے سے دنیا میں رائج قوانین کے اندر مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، جیسا کہ دکتور محمد عقلة الابراہیم نے اپنی کتاب ''**حكم إجراء العقود بوسائل الاتصال الحديثة**'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں چار نظریات جاری ہیں:

---

(۱) المغنی لابن قدامہ:۴/۷

(۲) دیکھو: المبدع شرح المقنع:۳/۴۰۴، شرح الزرکشي علی مختصر الخرقی:۲/۷

(۱) نظریۂ اعلان: جس کے مطابق قبول کرنے والا اپنی جگہ پر ایجاب کو قبول کر لے تو عقد لازم ہو جاتا ہے۔

(۲) نظریۂ تصدیر: جس کے مطابق قبول کرنے والے پر لازم ہے کہ اپنی قبولیت کا اظہار خط، ای میل یا کسی شخص کے ذریعہ بھیج دے۔اس کارروائی کے بعد عقد لازم ہو جاتا ہے۔

(۳) نظریۂ استلام: جس کے مطابق محض قبول کا بھیج دینا کافی نہیں، بل کہ دوسرے فریق کو وہ خط یا ای میل پہنچ جانا بھی لازم ہے، جب اس کو یہ پہنچ جائے گا تو قبول لازم ہوگا۔

(۳) نظریہ علم بالقبول: جس میں یہ بھی لازم ہے کہ وہ شخص اس قبول کا علم بھی پالے، یعنی وہ خط یا ای میل پڑھ لے تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے قبول کر لیا ہے۔(۱)

لیکن عام طور پر فقہائے اسلام نے جو لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول کرنے کا علم دوسرے فریق کو ہونا لازم نہیں ہے؛ بل کہ قبول کرتے ہی، عقد مکمل ہو جاتا ہے، خواہ قبول کرنے کا علم ایجاب کرنے والے کو ہو یا نہ ہو۔

"الموسوعة الفقهية" میں لکھا ہے:

" وَ لَا يُشْتَرَطُ فِي حَالَةِ انْعِقَادِ الْعَقْدِ بَيْنَ الْغَائِبَيْنِ عِلْمُ الْمُوجِبِ بِقَبُولِ الْقَابِلِ ، فَعِبَارَاتُ الْفُقَهَاءِ صَرِيحَةٌ بِأَنَّ الْعَقْدَ يَحْصُلُ بِمُجَرَّدِ قَبُولِ الْقَابِلِ فِي الْمَجْلِسِ."

(دو غائب لوگوں کے مابین عقد کے منعقد ہونے کی حالت میں ایجاب کرنے والے کا قبول قابل کو جاننا شرط نہیں، پس فقہاء کی عبارات صریح ہیں کہ عقد محض قبول کرنے والے کے مجلس میں قبول کر لینے سے منعقد ہو جاتا ہے۔(۲)

لیکن بعض قریبی دور کے اور موجودہ دور کے فقہا کی رائے یہ ہے کہ فریق ثانی کے قبول کا علم

(۱) حکم إجراء العقود:۸۴-۸۷

(۲) الموسوعة الفقهية:۲۱۸/۳۰

فریق اول یعنی موجب کو ہونا چاہئے، اسی وقت یہ عقد تام و لازم ہوگا۔ اگر اسے قبول کا علم نہ ہوگا تو عقد لازم نہ ہوگا۔

ماہر قانون دکتور عبدالرزاق السنہوری نے اسی کو اپنایا ہے، وہ اپنی کتاب "مصادر الحق فی الفقه الاسلامی" میں بالصراحت لکھتے ہیں:

"ونقول: إن منطق القاعدة التي تقول بوجوب سماع الموجب القبول في التعاقد بين حاضرين تقتضي القول بوجوب علم الموجب بالقبول في التعاقد بين غائبين. والسماع في حالة حضور الموجب يقابله العلم في حالة غيابه."

(ہم کہتے ہیں کہ اس قاعدے کی منطق جو یہ کہتا ہے کہ ایجاب کرنے والے کا قبول کو سننا لازم ہے، جب کہ دو حاضر لوگوں کے درمیان معاملہ ہو، یہی قاعدہ یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ ایجاب کرنے والے کا قبول کو جاننا بھی لازم کہا جائے، جب کہ دو غائبوں میں معاملہ ہو رہا ہو اور ایجاب کرنے والے کے حاضر ہونے کی صورت میں سماع، اس کے غائب ہونے کی صورت میں علم کے بالمقابل ہے۔(۱)

شیخ وھبہ الزحیلی اپنی بحث "إجراء العقود بآلات الاتصال الحديثة" میں لکھتے ہیں:

"و أرى الأخذ بضرورة العلم بالقبول بالنسبة للموجب في التعاقد بين الغائبين بسبب تقدم وسائل الاتصال الحديثة و تعقد المعاملات، و تحقيقاً لاستقرار التعامل و منع إيقاع الموجب في القلق و تمكيناً من إثبات العقد و إلزام القابل، فإن جهل الموجب بالقبول يوقعه في حرج شديد."

(۱) مصادر الحق:۲/۴۱

(میرا خیال ہے کہ ایجاب کرنے والے کے لحاظ سے قبولیت کے علم کی ضرورت کے قول کو لیا جائے جبکہ دو غائب لوگوں کے درمیان معاملہ ہو رہا ہو؛ اس وجہ سے کہ نئے وسائل ابلاغ واتصال میں ترقی اور معاملات میں پیچیدگی ہے اور اس وجہ سے کہ آپسی معاملات کو برقرار رکھا جاسکے اور ایجاب کرنے والے کو پریشانی میں ڈالنے سے بچایا جاسکے اور اس وجہ سے کہ عقد کو ثابت قرار دیا جاسکے اور قبول کرنے والے پر معاملہ کو لازم ٹھیرایا جاسکے؛ کیوں کہ ایجاب کرنے والے کا قبولیت سے جاہل ہونا اس کو شدید حرج میں مبتلا کرتا ہے۔(۱)

اس سلسلے میں مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم کی رائے یہ ہے کہ حضرات فقہا نے جو لکھا ہے کہ صرف اعلان واظہار قبول سے ہی عقد لازم ہوجاتا ہے، یہ بلحاظ دیانت ہے؛ لہذا جو اظہار قبول کردے گا، اس کے حق میں بیع لازم ہوجائے گی؛ لیکن قضاءً موجب کے حق میں یہ لازم نہ ہوگا، جب تک کہ وہ قبول کو پا کر اس کا علم نہ پالے۔(۲)

پانچواں اصول-ثمن کی ادائیگی

کاروبار میں جب ایجاب وقبول متحقق ہوجائے تو خریدار پر لازم ہے کہ وہ مبیع کا ثمن (قیمت) ادا کرے اور بائع پر لازم ہے کہ وہ مبیع (خریدی ہوئی چیز) اس کے سپرد کردے۔

الکٹرانک کاروبار میں ثمن کی ادائیگی کے طریقے

لہذا الکٹرانک کاروبار میں بھی لازم ہے کہ قیمت ادا کی جائے؛ مگر سوال یہ ہے کہ الکٹرانک کاروبار میں قیمت کی ادائیگی کا طریق کیا ہے؟ اور یہ کہ وہ طریقہ معتبر بھی ہے یا نہیں؟ اور اس سے کیا ثمن پر قبضہ متحقق ہوجائے گا؟

یہاں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عصر حاضر میں معاملات کی دنیا میں جو انقلابات وتغیرات رونما ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں الکٹرانک کاروبار میں ثمن کی ادیگی کے متعدد طریقے رائج ہوئے ہیں۔

(۱) مجلة الفقه الاسلامي: عدد:۸۸۹/۲/۶

(۲) فقه البيوع: ۶۲/۱

ایک طریقہ ثمن کی ادائیگی کا یہ چلا ہوا ہے کہ اس میں ''الکٹرانک نقود''یعنی (Electronic Money) کا استعمال کیا جاتا ہے اور آجکل اس کے لیے (Electronic cash)اور(Digital money)اور(Digital Currency) کی تعبیر بھی استعمال کی جاتی ہے۔

اوراس کے لیے الکٹرانک چیک، ماسٹر کارڈ اور ویزا کارڈ، اسمارٹ کارڈ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کے استعمال کرنے والوں میں سے ہر ایک کے پاس اپنا ایک (User ID)اور(Password) ہوتا ہے، اس کے ذریعے وہ الکٹرانک منی سے ادائیگی کرسکتا ہے۔

اسی طرح آج کل چیک، ڈرافٹ، کریڈٹ کارڈ، بینک اکاؤنٹ کے ذریعے رقم کی منتقلی کے ذریعے کاروبار و معاملات کرنے کا طریقہ بھی رائج ہے۔ چناں چہ لوگ آج زیادہ تر اپنے کاروبار میں ان طریقوں سے ثمن کی ادائیگی کرتے ہیں اور بینکوں اور مالیاتی اداروں میں اس کا لین دین جاری ہے۔

لہذا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان طریقوں سے ثمن کی ادائیگی کرنے سے کیا وہ قبضہ مانا جائے گا، اگر یہ قبضہ شمار ہوتا ہے تو کیا بیع الصرف میں بھی یہی صورت اپنائی جاسکتی ہے یا صرف عام کاروبار ہی میں ان کو اپنایا جاسکتا ہے؟ اس اہم سوال کے جواب میں دور حاضر کے علمائے فقہ کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے، لہذا ہم یہاں اس پر تفصیل کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔

(ا) بینک اکاؤنٹ سے رقم کی منتقلی کا حکم

اگر کوئی بینک اکاؤنٹ سے رقم کی ادائیگی کرے، اس طرح کہ خریدار اپنے بینک سے بائع (بیچنے والے) کے بینک کو اس کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کردے جس کو(Bank Transfer) کہتے ہیں تو اس صورت میں سبھی حضرات علما کے نزدیک قبضہ متحقق ہوجائے گا۔

شیخ الاسلام مولانا تقی عثمانی صاحب نے ''فقہ البیوع'' میں لکھا ہے:

''ربما يقع تسليم النقود عن طريق التحويل المصرفي و ذلک بأن يكون لزيد رصيد في حسابه الجاري لدى بنک ألف ، و لعمرو رصيد في حسابه الجاري لدى بنک ب ، فيأمر زيد بنک ألف أن يحول مبلغاً إلى رصيد عمرو في بنک ب۔ فحينما يدخل المبلغ في رصيد عمرو في بنک ب ، يعتبر عمرو قابضاً لتلک النقود. ''

(بعض اوقات نقدی کی ادائیگی بینک ٹرانسفر کے ذریعے ہوتی ہے اور یہ اس طرح کہ زید کا اکاؤنٹ کرنٹ کھاتے میں بینک (الف) کے پاس ہو اور عمرو کا کرنٹ اکاؤنٹ بینک (ب) میں ہو اور زید بینک الف کو آڈر دے کہ اتنی رقم بینک (ب) میں عمرو کے اکاؤنٹ میں منتقل کردے، پس جب یہ مبلغ رقم عمرو کی اکاؤنٹ میں داخل ہوجائے تو عمرو کو اس رقم پر قابض مانا جائے گا۔)(۱)

بینک ٹرانسفر کی تکییف فقہی میں مختلف آراء

البتہ اس میں علمائے عصر نے اختلاف کیا ہے کہ تحویل مصرفی (بینک اکاؤنٹ سے رقم کی منتقلی) کی تکییف فقہی کیا ہے؟

(ا) بہت سے علما نے اس کو ''سفتجہ'' یا اس کے مشابہ قرار دیا ہے اور سفتجے کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو اپنی رقم بطور قرض دے؛ تاکہ وہ دوسرے شہر میں اس کے کسی دوست یا متعلق کو وہ رقم دے دے؛ تاکہ راستے کے خطرات سے محفوظ ہوجائے۔

مثلاً زید کے پاس ایک شہر میں اس کا اپنا مال تھا اور وہ چاہتا تھا کہ یہ مال ایک دوسرے شہر لے جاؤں، مگر اس کو خوف تھا کہ راستے میں کہیں کوئی خطرہ نہ پیش آجائے جیسے ڈاکوؤں یا

---

(۱) فقہ البیوع: ۱/۴۴۱

چوروں کا ڈر تھا یا کسی اور چیز کا، لہٰذا اس نے کسی تاجر یا مسافر کو اپنا مال دیا کہ اس کو فلاں شہر میں فلاں کے پاس پہنچادے یا لینے والا ایک خط اپنے نائب یا دوست وغیرہ کے نام لکھ کر دے دے کہ خط لانے والے کو اتنا مال دے دیا جائے، اس طرح اس کا یہ مال وہاں پہنچ جائے گا اور خطرات سے بھی اس کا مال محفوظ ہو جائے گا۔

اس کا حکم کیا ہے؟ اس میں عام طور پر علما اس طرف گئے ہیں کہ اگر اس معاملے میں بطور شرط یہ بات طے ہو کہ اس رقم کو دوسرے شہر میں ادا کرے تو یہ جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ اور دوسرے شہر میں ادائیگی کی شرط پر اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے کی حقیقت قرض ہے اور قرض میں کسی طرح کا نفع حاصل کرنا ناجائز ہے اور یہاں قرض دینے والے کو راستے کے خطرات سے امن کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا شرط کے ساتھ یہ معاملہ ناجائز ہے اور بلا شرط ہو تو جائز ہے؛ لیکن چوں کہ بعض حضرات سے اس سلسلے میں جواز بھی منقول ہے تو یہ حضرات بینک ٹرانسفر کو سفتجہ کا حکم دیتے ہیں۔(۱)

(۲) اس میں دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حوالے کے حکم میں ہے۔ اور حوالہ کی تعریف میں اگرچہ فقہا کا اختلاف ہے، تاہم امام ابو یوسف کا قول اکثر نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے:

"الحوالة هو نقل الدين من ذمة إلى ذمة."

(دین کا ایک شخص کے ذمہ سے دوسرے کی جانب منتقل کر دینا۔)(۲)

اور شوافع نے بھی اسی طرح کی تعریف کی ہے:

"هي عقد يقتضي نقل الدين من ذمة إلى ذمة، وتطلق على انتقاله من ذمة إلى أخرى."

(۱) الحوالة والسفتجة بين الدراسة والتطبيق:۱۸۳

(۲) مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر :۱۴۶/۲، تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: الزيلعي :۱۷۱/۴، البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ابن نجيم :۲۶۶/۲

(یہ ایک عقد ہے جو دین کو ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی جانب منتقل کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور یہ دین کو ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی جانب منتقل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔)(۱)

اور حوالے میں تین اطراف ہوتے ہیں: ایک محیل (جو اپنا ذمہ دوسرے کے حوالے کرتا ہے اور وہ دراصل قرض دار ہے) دوسرا محتال (جس کا قرضہ ہے اور اس کو ادا کرنا مقصود ہے) اور تیسرا محتال علیہ (وہ جس کے حوالے کیا جاتا ہے اور وہ اس کو قبول کرتا ہے کہ یہ قرض میرے ذمہ لیتا ہوں) جو حضرات اس ''بینک ٹرانسفر'' کو حوالہ قرار دیتے ہیں، وہ رقم ٹرانسفر کرنے والے کو محیل اور جس کے نام ٹرانسفر کیا جانا ہے، اس کو محتال اور بینک کو محتال علیہ کے درجے میں مانتے ہیں۔

(۳) علمائے معاصرین میں سے بہت سے حضرات نے اس معاملے کی تکییف فقہی میں یہ کہا ہے کہ یہ ''وکالت'' ہے اور وکالت کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:

''كل عقد جاز أن يعقده الإنسان لنفسه جاز أن يوكّل به.''

(ہر ایسا عقد ہے جس کو انسان خود سے انجام دے سکتا ہے اس میں یہ بھی جائز ہے کہ دوسرے کو اپنا قائم مقام بنادے۔)(۲)

اور بعض حضرات نے اس طرح اس کو بیان کیا ہے:

''إقامة الشخص غيرَه مقام نفسه في تصرف جائز معلوم.''

(دوسرے شخص کو کسی جائز و معلوم کام میں تصرف کرنے کے لیے خود کا قائم مقام بنادینا۔)(۳)

---

(۱) شرح روض الطالب من أسنى المطالب: أبو زكريا الأنصاري: ۲۳۰/۳، مغني المحتاج: ۲۵۱/۲، حاشية الشربيني: ۱۹۲/۲

(۲) مختصر القدوري: ۱۱۵، هداية: ۱۳۶/۳

(۳) دیکھو: البحر الرائق: ۲۳۵/۷، الدر المختار مع الشامي: ۵۱۰/۵

اسی طرح یہاں ایک شخص اپنا کام بینک کے ذریعے کرا رہا ہے،لہذا جو شخص رقم بھیجنا چاہتا ہے وہ موکِّل ہے اور بینک جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہ اس کا وکیل ہے۔

(۴) بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ معاملہ دراصل اجارہ کا ہے کہ رقم بھیجنے والا اپنی رقم بھیجنے کے لیے بینک کو مستاجر بناتا ہے،لہذا رقم بھیجنے والا اجیر ہے اور بینک اس کا مستاجر جو متعلق شخص کے اکاؤنٹ میں رقم بھیجنے کا کام انجام دیتا ہے اور اس کام پر اجرت لیتا ہے۔

ایک اشکال کا جواب

مگر ''بینک ٹرانسفر'' کے سلسلے میں پائے جانے والے ان تمام نظریات میں سے ہر ایک کے بارے میں فقہی نقطۂ نظر سے کچھ نہ کچھ اشکال پایا جاتا ہے، اس لیے بہت سے حضرات علما کا خیال یہ ہے کہ یہ معاملہ مکمل طور پر مذکورہ نظریات میں سے کسی پر بھی منطبق نہیں ہوتا ،اس لیے یہ معاملہ متعدد معاملات سے مرکب ہے، کچھ سفتجہ سے، کچھ وکالت سے، کچھ حوالہ سے،لہذا یہ معاملہ ان سب سے مرکب ہے۔

چناں چہ اس نظریے کو متعدد حضرات نے اختیار کیا ہے، ان میں سے شیخ مصطفیٰ الزرقاء اور دکتور ابراہیم عبدالحمید ابراہیم سلامۃ اور دکتور جمال عطیہ ہیں جو ''الموسوعة الفقهية الكويتية'' میں اس موضوع پر کام کرنے اور بحث تیار کرنے والے ہیں اور انہی حضرات کی تحقیق کو سعودی عرب کے علما کی معتبر تنظیم ''هيئة كبار العلماء '' نے اختیار کیا ہے اور ''مجلة البحوث الإسلامية '' نے بھی اسی کو اختیار کرتے ہوئے اس کو شائع کیا ہے، اس بحث کے اخیر میں جو نتیجہ وخلاصہ بیان کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''والنتيجة التي تستخلص من كل ما سبق من كلام عن التحويلات المصرفية اليوم هي:أن التحويل المصرفي أو البريدي عملية مركبة من معاملتين أو أكثر ، و هو عقد حديث، بمعنى:أنه لم يجر العمل به على هذا الوجه المركب

فـي الـعهـو د السـابـقة ، ولـم يدل دليل على منعه ، فهو صحيح جـائـز شرعاً من حيث أصله بقطع النظر عما يـحيط به من مواد قـانـونية يـجـب لمعرفة حكمها استقصاؤها تفصيلاً و دراستها للحكم فيها . "

(آج کل کے بینک ٹرانسفر کے متعلق ماقبل کے کلام سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ بینک ٹرانسفر اور منی آرڈر دو یا زیادہ معاملات سے مرکب عمل ہے اور یہ اس معنی کر ایک جدید عقد ہے کہ گزشتہ ادوار میں اس طرح کے مرکب معاملے پر عمل درآمد جاری نہیں ہوا اور اس کے ممنوع ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، لہذا یہ شرعی لحاظ سے فی نفسہ صحیح و جائز ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کو قانونی دفعات کس قدر احاطہ کرتے ہیں، جن کا تفصیلی طور پر جاننا اور ان کا دراسہ ضروری ہو جاتا ہے۔)(۱)

یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے "منی آرڈر" کے سلسلے میں اپنے آخری فتوے میں لکھا ہے:

"منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چوں کہ ابتلائے عام ہے اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتوی مناسب ہے"۔(۲)

احقر کے نزدیک بینک سے رقم کی منتقلی کے اس مسئلے میں یہی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے، کہ اس کو مرکب مان کر ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی جائے اور اس سے قبضہ کا

(۱) الحوالة:۲۴۱،أبحاث هيئة كبار العلماء:۳۶۰/۵، مجلة البحوث الإسلامية:۱۶۲/۲۶

(۲) إمداد الفتاوى ، مطبوعہ کراچی:۱۴۶/۳

متحقق ہو جانا پہلے معلوم ہو چکا ہے۔

(۲) چیک (Cheque) اور ڈرافٹ (Draft) سے ثمن کی ادائیگی اور اس میں قبضے کی بحث

چیک اور ڈرافٹ سے ثمن کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ قبضے کے حکم میں آتا ہے؟ اس سلسلے میں عصر حاضر میں علما کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک رائے علما کی یہ ہے کہ چیک ہر صورت میں خواہ وہ مصدقہ ہو یا نہ ہو، اس پر قبضہ قبضہ شرعی کے حکم میں ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے تحت مجلس ''المجمع الفقهي الإسلامي'' کے ارکان نے اسی کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ ان کی ایک قرارداد سے مفہوم ہوتا ہے۔

چناں چہ مكة المكرّمہ میں منعقد گیارھویں اجلاس بتاریخ ۱۳ تا ۲۰/ رجب ۱۴۰۹/، موافق: ۱۹ تا ۲۶/ فروری ۱۹۸۹، جو قرارداد منظور کی، اس میں ہے:

''يقومُ استلامُ الشِّيك مقامَ القَبض، عند تَوَفُّر شُروطِه في مسألة صَرف النُّقُود بالتحويل في المَصَارف.''

(چیک کا قبول کرنا قائم مقام قبض کے ہے، جب کہ وہ سب شرائط پائی جائیں جو بینک سے نقدی کے ٹرانسفر کی مسئلے میں ہیں۔)(۱)

اسی طرح ''الموسوعة الكويتيه'' کے ارکان نے بھی چیک کو مطلقاً قبضے کے حکم میں مانا ہے۔ وہ حضرات لکھتے ہیں:

''فإذا نظرنا إلى أنَّ الشِّيكاتِ تُعْتَبَرُ في نظر النَّاس وعُرفِهم وثِقَتِهم بمثابة النُّقُود الوَرِقيّة و أنه يجري تداولُهَا بينهم كالنُّقُود تظهيراً وتحويلاً، و أنها محمية في قوانين جميع الدول من

(۱) قرارات المجمع الفقهي الإسلامي

حیث إنّ سحب الشِّیک علی جهةٍ لیس للساحب فیها رَصِیدٌ یَفِي بقیمة الشیک المَسْحُوب یُعتَبَرُ جریمةً شدیدةً تعاقب علیها قوانین العُقُوبات في الدُّوَل جمیعاً ، إذا نظرنا إلی هذه الاعتبارات یُمکِنُ القولُ معها بأن تسلیمَ المَصْرفِ الوسیطِ شیکاً بقیمة ما قَبَضَ من طالب التحویل یُعْتَبَرُ بمثابة دفع بدل الصَّرف في المجلس."

(جب ہم چیکوں کی جانب دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی نگاہ اوران کے عرف میں اوران کے اعتماد میں انھیں کرنسی نوٹوں کی طرح قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ ان کے آپس میں ان کا رواج وچلن ان پر دستخط کرنے اورٹرانسفر کرنے کے لحاظ سے نقدی کی طرح ہوتا ہے اور یہ کہ چیکوں کوتمام مما لک کے قوانین میں اس حیثیت سے تحفظ حاصل ہے کہ جب چیک کیش کیا جائے اس شخص کے اکاؤنٹ سے جس کے پاس چیک کی قیمت کے برابر رقم دینے کو نہ ہو،تو یہ بڑا سخت جرم سمجھا جاتا ہے،جس پر تمام ملکوں کے قانون تعزیرات کی بنا پر سزا جاری کی جاتی ہے، جب ہم ان سب امور کی جانب دیکھتے ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بینک جو کہ واسطہ ہے اس کا اس قیمت کی چیک کا سپرد کر دینا جس قدر کہ ٹرانسفر کرنے والے سے لیا ہے، یہ بدل صرف کے مجلس میں دینے کے برابر ہے۔(۱)

اسی طرح علامہ وھبہ الزحیلی نے بھی لکھا ہے:

چیک پر قبضہ تا کہ بینک سے وصولی کی جائے قبضۂ حکمی کی صورت ہے۔(۲)

اس نظریے کے قائلین نے دلیل میں ایک تو یہ کہا ہے کہ امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ

(۱) الموسوعة الکویتیة :الحوالة:۲۳۸

(۲) الموسوعة القضایا المعاصرة:۴۲/۱۱

حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ مکہ میں کچھ لوگوں سے دراہم لیتے تھے اور ایک پرچی لکھ کر مصعب بن الزبیر کے پاس عراق بھیجتے تھے اور وہ لوگ اپنے دراہم ان سے وہاں وصول کر لیتے تھے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل چیک سے تعامل کی نظیر ہے؛ کیوں کہ دراہم لے کر جو پرچی لکھ کر دیتے وہ چیک کے قائم مقام ہے اور اسی کو دکھا کر لوگ مصعب بن الزبیر سے اپنے دراہم وصول کر لیتے تھے۔

ان لوگوں نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ چیک چوں کہ قانونی لحاظ سے ایک دستاویزی حیثیت رکھنے والی چیز ہے اور اس کو قانونی تحفظ حاصل ہے اور اسی لیے کوئی شخص اگر چیک دے؛ مگر اکاونٹ میں اتنی رقم نہ ہو تو اس کو تمام ملکی قوانین میں جرم قرار دیا جاتا ہے، لہذا اس تمام وجوہات سے چیک پر قبضے کو قبضہ ہی کے حکم میں ماننا مناسب ہے۔

تیسری بات یہ کہتے ہیں کہ عرف عام میں بھی لوگ اس کو نقود کی طرح استعمال کرتے ہیں اور یہی سمجھتے ہیں۔

چوتھی بات یہ کہی جاتی ہے کہ تجارتی و اقتصادی عرف بھی یہی ہے کہ چیک کو اپنے کاروباری معاملات میں قبضے کی طرح سمجھ کر قبول کرتے اور دیتے ہیں۔

لہذا چیک پر قبضہ شرعی و حکمی قبضے کی طرح سمجھا جائے گا اور اس پر قبضہ نقود پر قبضے کی طرح ہوگا۔(۲)

(۲) اس سلسلے میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چیک کسی بھی حال میں قبضے کے حکم میں نہیں

---

(۱) سنن بیهقي: ۵/۵۷۶

(۲) دیکھو: بحوث في الاقتصاد الإسلامي للعلامة الشیخ عبد الله بن سلیمان المنیع :۳۷۵، أحکام الشیک -دراسة فقهية :۵۶-۵۷، أحکام الأوراق النقدیة للجعید:۳۳۲

ہے۔شیخ ابن عثیمین اور شیخ حسن ایوب کی یہی رائے ہے۔(۱)

ان لوگوں نے چند دلائل سے کام لیا ہے:

ایک دلیل یہ دی ہے کہ چیک کبھی ضائع ہوجاتی ہے، کبھی منجمد کردی جاتی ہے، کبھی خود چیک دینے والا اس کوموقوف کردیتا ہے یا اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود نہیں ہوتی، لہذا ان صورتوں میں چیک پر قبضے کواصل رقم پر قبضہ کیسے مانا جاسکتا ہے؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ چیک دینے کے بعد چیک سے معاملہ کرنے والوں کے مابین معاملہ ختم نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ وہ چیک سے اپنی رقم وصول نہ کرلے۔اسی لیے بسا اوقات اگر چیک ضائع ہوجائے تو چیک دینے والے کی جانب رجوع کر کے دوسری چیک لی جاتی ہے، اگر چیک پر قبضہ اصل رقم ونقود پر قبضہ ہوتا تو دوبار چیک لینا کیسے درست ہوتا ؟ جیسے نقدی جب کسی کو دے دی جاتی ہے تو وہ اگر ضائع ہوجائے تو دوبارہ کوئی اس کو نہیں دیتا؛ مگر چیک دوبارہ بھی دی جاسکتی ہے۔

اور تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر چیک پر ایک لمبا عرصہ گزر جائے اور اس کی قانونی مدت (جو عام طور پر تین ماہ ہوتی ہے) پوری ہوجائے تو وہ چیک ناقابل قرار پاتی ہے۔اگر چیک پر قبضہ کو قبضہ مان لیا جائے تو اس صورت میں اس کا کیا ہوگا؟

ان دلائل کی روشنی میں وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ چیک کسی بھی طرح سے قبضۂ شرعی کے حکم میں نہیں ہوسکتی۔(۲)

(۳)اس سلسلے میں تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علی الاطلاق چیک کو قبضہ قرار دینا صحیح نہیں، بل کہ اس میں تفصیل ہے، کیوں کہ چیک کئی طرح کا ہوتا ہے، لہذا چیک کی قسموں کے لحاظ

---

(۱) قبض الشیک : ص: ٦، أحکام الشیک دراسة فقهیه لعیسی العوادة:۵۷

(۲) دیکھو:بحوث فی الاقتصاد الإسلامي :۳۳۷۸-۳۳۷٦، أحکام الشیک دراسة فقهیه:۵۷

سے اس کے احکام بھی مختلف ہیں۔یہی نقطۂ نظر شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع ،سعد بن ترکی الخثلان،حسام الدین عفانۃ اور صدام عبدالقادر عبداللہ وغیرہ حضرات نے اپنایا ہے۔

علامہ شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع نے اسی کو اختیار کیا ہے،چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

" والذي يظهر لي والله أعلم .أن الشيک المُعتبَر والذي هو في معنى القبض هو الشيک المصدق ، و تأسيساً على هذا فإذا اشترى الفرد ذهباً أو فضةً بثمن آخر و بموجب شيک بذلک الثمن ؛ فإن كان مصدقاً فقبضُه قبضٌ لمحتواه والمصارفة بذلک صحيحة ، و إن كان غير مصدق فقبضُه ليس قبضاً لمشموله ، و بالتالي فقبضُه ليس في حكم القبض المبرئ للذمّة ، و المصارفة بموجبه في رائي غير صحيحة ؛ لأنَّ التقابُض في مجلس العقد غير مُتَحَقَّق."

(جو بات کہ مجھ پر ظاہر ہوئی واللہ اعلم۔یہ ہے کہ معتبر چیک اور جو قبضے کے حکم میں ہے،وہ وہ چیک ہے جو تصدیق شدہ ہو،لہٰذا اس بنیاد پر اگر کوئی شخص سونا یا چاندی کسی اور ثمن کے بدلے یا چیک کے بدلے خریدے تو اگر وہ چیک مصدقہ ہے تو اس پر قبضہ اس کے اندر لکھی ہوئی قیمت کا قبضہ ہوگا اور اس طرح بیع الصرف درست ہو جائے گی اور اگر چیک غیر مصدقہ ہو تو اس پر قبضہ اس کے اندر لکھی ہوئی قیمت پر قبضہ نہ ہوگا اور نتیجۃً اس پر قبضہ اس قبضے کے حکم میں نہ ہوگا جو ذمے داری سے بری کرتا ہو،اور ایسی چیک سے صرف کا معاملہ کرنا میری رائے میں صحیح نہ ہوگا؛ کیوں کہ تقابض مجلس میں متحقق نہ ہو۔)(۱)

نیز ایک اور موقعہ پر اس سلسلے میں بعد البحث خلاصہ لکھتے ہیں:

(۱) بحوث في الاقتصاد الإسلامي:۳۲۷

”و تأسيساً على ما سبق ذكرُه يُمكِنُنا القولُ بأنّ الشيك قبضُه قبضٌ لمحتواه إذا كان مُصَدَّقاً ، أو في قُوَّة التصديق ، و ذلك بصدوره مِمَّن تَتَوَفَّرَ فيه الثقةُ والاطمئنانُ و سلامةُ التعامل التجاري ممَّنْ هو أمينٌ على شرفه و مقامه و عُلوِّ سمعته و يُعْتبر قبضاً لمحتواه في عملية المصارفة إذا كان مُصْدِر الشيك يملك المبلغ المشمول بالشيك سواء في صناديقه المحلية ، أو في الصندوق المركزي في مقره الرئيسي .“

(اوپر ذکر کردہ امور کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چیک پر قبضہ اس میں لکھے ہوئے پر قبضہ ہے بشرطے کہ وہ مصدقہ ہو یا مصدقہ کے حکم میں ہو اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جبکہ وہ اس شخص کی جانب سے صادر ہو جس میں اعتماد و اطمینان اور تجارتی معاملات میں سلامتی کی صفات پائی جائیں ان لوگوں میں سے جو اپنے شرف و مقام اور نیک شہرت کے ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہو اور اس پر قبضے کو بیع الصرف میں بھی اس کے مشمول پر قبضہ سمجھا جائے گا، جب کہ چیک کو جاری کرنے والا چیک میں لکھے مبلغ کا مالک بھی ہو خواہ مقامی صندوق میں ہو یا مرکزی صندوق میں اپنے مرکزی مقام پر ہو۔)(۱)

نوٹ :احقر عرض کرتا ہے کہ شیخ المنیع کی یہ بات کہ ”غیر مصدق سادی چیک سے سونا یا چاندی خریدنا جائز و صحیح نہیں“ یہ ان حضرات کی رائے کے مطابق ہے جو چیک کو سونا یا چاندی کا قائم مقام مانتے ہیں، لیکن جو حضرات اس کو سونے و چاندی کے بجائے کرنسی کا قائم مقام مانتے ہیں اور کرنسی کو فلوس کی طرح مستقل ثمن مانتے ہیں، ان کی رائے میں اس سے سونا چاندی خریدنا جائز ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ بیع الصرف نہیں ہے، جیسا کہ اپنی بعض تحریرات میں ہم نے تفصیل سے لکھ دیا ہے۔

---

(۱) بحوث في الاقتصاد الإسلامي:۳۸۶

اور شیخ عبداللہ بن محمد بن صالح الربعی نے اپنے رسالے ”قبض الشیک ، هل یقوم مقام قبض النقد ؟ میں تینوں اقوال کے تذکرے اوران پر مناقشے کے بعد اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ تمام چیک ایک حکم میں نہیں ؛ بل کہ ان میں تفصیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

” وبالتأمُّل في هذه الأقوال نَجِدُ أنَّها طرفان و وسط :فالذين مَنَعُوا من اعتبار الشيک في هذه المسائل مطلقاً ، فَاتَهُم إعمالَ النَّظر فيما يعنيه : تصديق البنک الشيک وقبول المستفيد هذا النوع من الشيكات و استلامه إياه وقبوله بقاء المبلغ المقيد في شيكه تحت يد البنک . وإعمال النظر في هذه الأمور يُوصِلُ إلى الحُكم الأقرب إلى موافقة الدليل .“

” أمَّا الَّذِينَ أطلقُوا القولَ في الشيكات بأنَّ قبضها كقبض النقد ، حتى غير المُصَدَّقة منها ، فقد فَاتَهُم إعمالُ الفُرُوقِ المُؤَثِّرَة بين النقد والشيكات ، و فَاتَهُم أيضاً اعتبارُ العُيُوبِ و المَخَاطِر التي تعرض للشيكات و تؤدي في حال وجودها إلى تفويت حق قابض الشيک أو إلى تعليقه . والقول الوسط في هذه المسئلة هو القول الأول الذي يقول: بأن قبضَ الشيک العادي لا يُعَدُّ قبضاً لمحتواه في هذه العقود التي يشترط لبقائها على الصحة القبض قبل التفرق . أما الشيک المصدَّق فإن قبضه كقبض محتواه .“

(ان اقوال میں غور کرنے سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں دوقول دو انتہاؤں میں ہیں اور ایک درمیانی ہے،پس جن لوگوں نے ان مسائل میں چیک کے معتبر ہونے سے مطلقاً انکار کیا ہے، ان کی نظر سے چیک کے بینک

کی جانب سے تصدیق کیے جانے، چیک وصول کنندہ کے اس قسم کی چیک کے قبول کرنے اور اس کے اس کو وصول کرنے اور چیک میں درج رقم کے بینک کے تحت ہونے کو قبول کرنے کا اہم پہلو فوت ہوگیا۔ اور ان امور میں نظر کرنے سے اقرب الی الدلیل حکم کی جانب پہنچا جا سکتا ہے۔ اور رہے وہ لوگ جو چیکوں کے بارے میں علی الاطلاق یہ کہتے ہیں کہ ان پر قبضہ نقدی پر قبضے کی طرح ہے؛ یہاں تک کہ غیر مصدقہ چیک بھی، تو ان کی نظر میں سے نقدی اور چیکوں کے درمیان اثر انداز فرق کا پہلو رہ گیا اور نیز چیکوں کے حوالے سے عیوب اور وہ خطرات جو چیکوں کو لاحق ہوتے ہیں اور چیک پر قبضہ کرنے والے کے حق کے فوت ہونے یا اس کے معلق ہونے تک پہنچاتے ہیں، وہ بھی ان کی نگاہوں سے رہ گئے۔ اور معتدل قول اس مسئلے میں پہلا قول ہی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ سادہ چیک کو ان معاملات میں اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں مانا جائے گا جن میں جدائی سے پہلے قبضہ کو صحت پر برقرار رہنے کی شرط مانا گیا ہے، رہی مصدقہ چیک تو اس پر قبضہ اس میں درج رقم پر قبضے کی طرح ہوگا۔)(۱)

نیز حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، وہ اپنی کتاب ”فقه البیوع“ میں لکھتے ہیں:

”ولكن الصحيح عندنا أنَّه لا يُمكِنُ القولُ بأنَّ قبضَ جميع الشيكات في حكم قبض محتواه .“

(لیکن ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہ کہنا ممکن نہیں کہ تمام قسم کے چیک پر قبضہ اس میں درج رقم پر قبضے کے حکم میں ہے۔)(۲)

---

(۱) قبض الشیک ،هل يقوم مقام قبض النقد:۱۷

(۲) فقه البيوع:۱/۴۴۳

الحاصل تیسرا قول اس سلسلے کا یہ ہے کہ چیک کی مختلف حالتوں اور نوعیّتوں کی وجہ سے ان کا کوئی ایک حکم نہیں ہوسکتا؛ بل کہ ان کی اقسام کے پیش نظر ان کے احکام بھی اس سلسلے میں مختلف ہیں، کہ بعض چیک قبضے کے حکم میں ہے اور بعض قسم کی چیک اس کے برخلاف قبضے کے حکم میں نہیں ہے۔

چیک (Cheque) کی اقسام اور ان کے احکام

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چیک ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) ڈرافٹ (۲) مصدقہ چیک (۳) ذاتی چیک، لہذا ان کے احکام بھی مختلف ہیں:

❁ بینک ڈرافٹ (Bank Draft): چیک کی ایک قسم ''بینک ڈرافٹ'' ہے ،جس کو عربی میں '' الشیک المصرفي'' کہتے ہیں، بینک ڈرافٹ میں چوں کہ ڈرافٹ لینے والا بینک کو اولاً اس قدر رقم نقد یا اپنے اکاؤنٹ سے ادا کر دیتا ہے اور پھر بینک اس کو اس رقم کا ڈرافٹ جاری کرتا ہے، اس لیے جس کے نام کا ڈرافٹ ہوتا ہے اس کو اس قدر رقم کا ادا کرنا فوری طور پر بینک کے ذمہ لازم ہوتا ہے اور بینک کسی بھی حال میں اس کو رد نہیں کرسکتا، کیوں کہ اتنی رقم کو بینک محفوظ کر دیتا ہے؛ لہذا ڈرافٹ کا حکم یہ ہے کہ اس پر قبضہ کر لینا رقم پر قبضے کے حکم میں ہے۔

پھر ''بینک ڈرافٹ'' کی تکییف فقہی کے بارے میں اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ عقدِ وکالت ہے جو حامل چیک اور بینک کے مابین ہوتا ہے، کہ حامل چیک بینک کو اپنی رقم محفوظ کرنے اور اس کو پہنچانے کا وکیل بناتا ہے اور بینک اس کی جانب سے وکالت کرتے ہوئے چیک میں مرقوم رقم کو محفوظ کرتا اور مطالبے پر حامل چیک کو پہنچا دیتا ہے۔

مگر اس کو عقدِ وکالت قرار دیا جائے تو یہاں متعدد اشکالات واقع ہوتے ہیں:

(۱) سوال یہ ہے کہ یہاں حامل چیک نے بینک کو صراحۃً وکیل نہیں بنایا ہے تو یہ عقد توکیل کیسے ہوا؟ اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ یہاں اگر چہ کہ بالصراحۃ توکیل نہیں پائی

گئی ؛ مگر جب حامل چیک نے چیک کو قبول کرلیا تو گویا اس نے بینک کو قبض ثمن میں وکیل بنالیا۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یہی لکھا ہے، آپ فرماتے ہیں:

"ولكن البائع في مسئلتنا لم يُوكِّله بذلک صراحةً إلّا أن يُقَال: إنه حينما قبل البائع أن يدفع الثمن بطريق الشيک المصرفي ، فكأنه جعل البنک المصدر للشيک وكيلاً له في قبض الثمن ."

(لیکن بائع نے ہمارے اس مسئلے میں صراحتاً اس (بینک) کو وکیل نہیں بنایا ہے؛ مگر یہ کہ یوں کہا جائے کہ جس وقت بائع نے اس بات کو قبول کرلیا کہ ثمن چیک کے ذریعے دیا جائے تو گویا اس نے چیک جاری کرنے والے بینک کو ثمن پر قبضے کا وکیل بنادیا۔)(۱)

اسی طرح شیخ عبداللہ بن محمد الربعی نے "قبض الشيک هل يقول مقام قبض النقد" میں فرمایا کہ:

"إن قبول المسحوب له الشيک المصدق يعنى أنه رضى بكون البنک وكيلاً عنه في قبض المبلغ المقيد في هذ الشيک."

(جس کے لیے چیک ڈرا کی گئی ہے اس کا مصدقہ چیک کو قبول کرلینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ چیک میں درج رقم کی وصولی میں بینک کو اپنا وکیل بنانے پر راضی ہوگیا۔)(۲)

(۲) یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بسا اوقات حامل چیک کو چیک قبول کرتے

---

(۱) فقه البيوع: ۱/۴۴۶

(۲) قبض الشيک هل يقوم مقام قبض النقد: ۱۸

ہوئے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کس بینک کا یہ چیک ہے، تو اس صورت میں چیک کے قبول کرنے کو توکیل کے قائم مقام قرار دیا جائے تو یہ توکیل مجہول ہے جو کہ جائز نہیں؟ چناں چہ فقہا نے لکھا ہے کہ وکیل کا مجہول ہونا وکالت کی صحت میں مانع ہے۔

چناں چہ "**درر الحکام شرح مجلة الاحکام**" میں ہے:

"كَوْنُ الْوَكِيلِ مَعْلُومًا شَرْطٌ يَعْنِي أَنَّهُ يُشْتَرَطُ أَلا يَكُونَ الْوَكِيلُ مَجْهُولًا جَهَالَةً فَاحِشَةً ."

(وکیل کا معلوم ہونا بھی شرط ہے یعنی یہ شرط ہے کہ وکیل بہت زیادہ مجہول نہ ہو۔)(۱)

اور شوافع کی کتاب "**مغني المحتاج**" میں ہے:

"يُشْتَرَطُ فِي الْوَكِيلِ أَيْضًا تَعْيِينُهُ ، فَلَوْ قَالَ لِاثْنَيْنِ: وَكَّلْت أَحَدَكُمَا فِي بَيْعِ دَارِي مَثَلًا ، أَوْ قَالَ :أَذِنْت لِكُلِّ مَنْ أَرَادَ أَنْ يَبِيعَ دَارِي ، أَنْ يَبِيعَهَا لَمْ يَصِحَّ."

(وکیل میں یہ بھی شرط لگائی گئی ہے کہ وہ متعین ہو، لہذا اگر دو شخصوں سے کہا کہ میں تم میں سے ایک کو میرا گھر بیچنے کا وکیل بناتا ہوں یا یہ کہا کہ میں میرا گھر بیچنے کی اجازت دیتا ہوں کہا ان سب کو جو اس کو بیچنے کا ارادہ کریں، تو یہ وکالت صحیح نہ ہوگی۔)(۲)

اس کا جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یہ دیا ہے کہ توکیل مجہول کے ناجائز ہونے کی وجہ اس کا مفضی الی النزاع ہونا ہے، کیوں کہ ممکن ہے کہ ایک قرضدار آدمی کسی ایسے شخص کے حوالے قرض کی رقم کردے جس کو وہ مدیون کا وکیل سمجھتا تھا اور بعد میں قرض دہندہ یہ کہہ

---

(۱) درر الحکام:۳/۵۴۶

(۲) مغني المحتاج:۲/۲۸۳

دے کہ وہ میرا وکیل نہیں تھا تو یہ بات نزاع کا سبب بنے گی، لہذا وکیل کا معلوم و متعین ہونا لازم ہے؛ لیکن ڈرافٹ کے جاری کرنے میں نزاع کا خطرہ نہیں، کیوں کہ یہ موجودہ دور میں قابل وثوق ذرائع میں شمار ہوتا ہے، لہذا یہاں نزاع والی بات نہیں پائی جاتی؛ اس لیے مجہول ہونے کے باوجود یہ صورت جائز ہے۔(۱)

احقر کہتا ہے کہ اس سوال کا ایک اور جواب بھی ممکن ہے، وہ یہ کہ ایک ہے خود وکیل کا مجہول ہونا کہ وکیل متعین نہ ہو اور ایک ہے وکیل متعین ہونے کے باوجود وکیل کا پتہ نہ لگنا، پہلی بات کو توکیل مجہول اور دوسری صورت کو جہالت بالوکیل کہا جاتا ہے۔"**درر الحکام شرح مجلة الاحکام**" میں پہلی صورت کو صحت وکالت میں مانع قرار دیا ہے؛ جب کہ دوسری صورت کو مانع صحت نہیں؛ بل کہ جائز قرار دیا ہے۔

چناں چہ وہ اوپر والی عبارت کے بعد جس میں توکیل مجہول کو نادرست قرار دیا ہے، یہ لکھتے ہیں:

" أَمَّا الْجَهْلُ بِالْوَكِيلِ جَهَالَةً فَاحِشَةً فَلا تَمْنَعُ مِنْ صِحَّةِ الْوَكَالَةِ. وَعَلَيْهِ فَلَوْ قَالَ أَحَدٌ لِاثْنَيْنِ مُعَيَّنَيْنِ خِطَابًا لَهُمَا." وَكَّلْتُ أَحَدَكُمَا بِبَيْعِ فَرَسِي هَذَا، جَازَتْ. وَ أَيُّهُمَا بَاعَهُ كَانَ الْبَيْعُ صَحِيحًا نَافِذًا . "

(رہا وکیل کا بہت زیادہ مجہول ہونا تو یہ صحت وکالت میں مانع نہیں ہے؛ لہذا اگر کسی نے دو متعین لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تم دونوں میں سے ایک کو اس بات کا وکیل بنایا ہے کہ میرا گھوڑا فروخت کیا جائے، تو یہ جائز ہے۔ اور ان دونوں میں سے جو کوئی بھی یہ گھوڑا بیچے تو یہ بیع صحیح اور نافذ ہوگا۔)(۲)

(۱) دیکھو: فقه البیوع:۱/۴۴۵

(۲) درر الحکام:۳/۵۴۶

لہذا یہاں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وکیل تو متعین و معلوم ہے؛ کیوں کہ جس بینک کا ڈرافٹ ہے وہ متعین ہے؛ مگر اول وہلے میں بائع کو پتہ نہ ہوا؛ لیکن بعد میں تو معلوم ہو ہی جائے گا؛ لہذا یہ جہل بالوکیل ہے، نہ کہ توکیل بالمجہول۔ واللہ اعلم

(۳) اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر ڈرافٹ پر قبضے کو صحیح مانیں تو بینک بائع کی جانب سے وکیل بالقبض ہوگا، تو پھر بینک کو اس میں تصرف ممنوع ہونا چاہیے؛ کیوں کہ یہ رقم بینک کے پاس امانت ہے اور امانت میں تصرف جائز نہیں، حالاں کہ بینک اس رقم کو خریدار سے لے کر اپنے تصرف میں لاتی ہے اور جب حامل چیک مطالبہ کرتا ہے اس وقت اس کو دیتی ہے۔

اس کے جواب میں حضرت عثمانی یہ کہتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ممکن ہے کہ یہ رقم ابتداءً تو امانت تھی؛ لیکن جب بینک نے اس کو اپنے دیگر اموال میں خلط کر دیا تو اب یہ امانت نہیں رہی؛ بل کہ اس کی ضمانت میں داخل ہوگئی۔ لہذا اس کو تصرف کی اجازت بھی ہوگی۔ (۱)

(۴) ڈرافٹ کو وکالت قرار دینے پر ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ ڈرافٹ بنا کر دینے کے لیے بینک اجرت لیتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہم اس کو وکالت بالاجر کہہ سکتے ہیں اور وکالت بالاجر تمام فقہا کے نزدیک جائز ہے، یا اس کو وکالت کی اجرت کے بجائے چیک بنانے کی اجرت قرار دیا جا سکتا ہے، جس طرح کہ منی آرڈر کے سلسلے میں لی جانے والی رقم کو اجرت قرار دیا گیا ہے۔ اور وکالت بالاجر بھی فی الواقع اجارے ہی کی ایک صورت ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

” ویجوز التوکیل بجُعل و غیر جُعل .... فإنْ کانتْ بجُعل استحقّ الوکیل الجُعل بتسلیم ما وُکّل فیه إلی المُوکِّل إن کان مِمّا یُمکن تسلیمه ، کثوب ینسجه ، أو

(۱) دیکھو: فقه البیوع: ۱/۴۴۶

يقصره ، أو يخيطه ، فمتى سَلَّمَهُ إلى المُوكِّل معمُولاً ، فله الأجرُ ، و إن كان الخيَّاطُ في دار المُوكِّل ، فكلَّمَا عَمِلَ شيئاً وقع مقبوضاً ، فيستحقّ الوكيلُ الجُعل إذا فرغ الخيّاط من الخياطة ، و إن وَكَّلَ في بيعٍ ، أو شراءٍ ، أو حجٍ إستحقّ الأجر إذا عَمِلَه ، و إن لم يقبض الثمن في البيع."

(اور اجرت پر یا بلا اجرت وکیل بنانا جائز ہے..........پس اگر اجرت پر توکیل ہو تو وکیل اجرت کا مستحق قرار پائے گا جب وہ اس چیز کو موکل کے حوالے کردے گا، جس میں اس کو وکیل بنایا گیا تھا، بشرطے کہ وہ ان چیزوں میں سے ہو جن کو سپرد کیا جانا ممکن ہو، جیسے کپڑا جس کو بننے یا دھونے یا سینے دیا گیا تھا، لہذا جب بھی وہ اسے سپرد کردے گا اجرت کا حقدار ہوگا۔ اور اگر درزی موکل ہی کے گھر میں ہو تو جس قدر بھی کام وہ کرتا جائے اس قدر پر قبضہ ہوتا جائے گا اور وکیل اس وقت مستحق اجرت ہوگا جب درزی سینے کے کام سے فارغ ہوجائے گا۔ اور اگر بیچنے یا خریدنے یا حج کرنے میں وکیل بنایا تو اس کام کے انجام دینے پر وہ مستحق اجرت ہوجائے گا، اگرچہ کہ بیع کی صورت میں ثمن پر قبضہ نہ ہوا ہو۔)(۱)

اور علامہ ابن جزی مالکی "القوانين الفقهية" میں لکھتے ہیں:

"تجوز الوكالة بأجرة ، و بغير أجرة ، فإن كانت بأجرة، فحكمها حكم الإجارات ، و إن كانت بغير أجرة ، فهو معروف من الوكيل."(۱)

(وکالت اجرت کے ساتھ اور بلا اجرت دونوں طرح جائز ہے، اگر اجرت

(۱) المغني:۲۱۰/۵

(۲) القوانين الفقهية:۲۱۵

کے ساتھ ہوتو اس کا حکم دیگر کرایہ داری کے معاملات کی طرح ہے اور اگر بلا اجرت ہوتو وہ وکیل کی جانب سے احسان ہے)

اور مجلۃ الاحکام العدلیۃ میں ہے:

"إذا شُرِطَتْ الْأُجْرَةُ فِي الْوَكَالَةِ وَ أَوْفَاهَا الْوَكِيلُ اسْتَحَقَّ الْأُجْرَةَ ، وَإِنْ لَمْ تُشْتَرَطْ وَ لَمْ يَكُنْ الْوَكِيلُ مِمَّنْ يَخْدُمُ بِالْأُجْرَةِ كَانَ مُتَبَرِّعًا. فَلَيْسَ لَهُ أَنْ يُطَالِبَ بِالْأُجْرَةِ."

(اگر وکالت میں اجرت کی شرط لگائی گئی تھی اور وکیل نے اس کام کو پورا کردیا تو وہ اجرت کا مستحق ہوجائے گا اور اگر شرط نہیں لگائی تھی اور وکیل ان لوگوں میں سے نہ ہو جو اجرت پر کام کرتے ہیں تو یہ تبرع کرنے والا شمار ہوگا، لہٰذا اس کو اجرت کے مطالبے کا حق نہ ہوگا۔)(۱)

خلاصہ یہ کہ ڈرافٹ کو چوں کہ قانونی تحفظ حاصل ہے اور اس میں مذکور رقم کے مستحق کو پہنچنے میں کوئی خطرہ بھی نہیں ہے؛ اس لیے اس کو قبضے کے حکم میں مانا جائے گا۔ اور جہاں معاملات میں قبضہ ضروری ہے جیسے بیع الصرف ان میں چیک پر قبضے کو قبضہ بوساطۂ وکالت قرار دیا جائے گا۔

تصدیق شدہ چیک:(Certified Cheque)

دوسری قسم چیک کی وہ ہے جس کو مصدقہ چیک (Certified Cheque) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی چیک پر بینک کی تصدیق ہوتی ہے کہ چیک پر درج رقم اس شخص کے اکاؤنٹ میں موجود ہے اور اس کو حامل چیک نکال سکتا ہے۔ اور عام طور پر بینک اس پر یہ لکھتا ہے: Accepted (یعنی مقبول)۔

ظاہر ہے کہ اس کا حکم بھی ڈرافٹ ہی کا حکم ہے کہ اس پر قبضہ اصل رقم پر قبضے کے حکم میں ہوگا؛ کیوں کہ یہاں بھی رقم محفوظ ہوجاتی ہے اور بلا کسی خطرے کے وہ حامل چیک کو مل جاتی ہے۔

---

(۱) مجلة الأحكام العدلية: ٢٨٥

شیخ عبداللہ بن محمد الربعی ''مصدقہ چیک'' کے قبضے کے حکم میں ہونے کی وجوہات بتاتے ہوئے ایک وجہ یہ لکھتے ہیں:

''إن المبلغ المعين فيه في قبضة البنك ، و محجوز لديه بالعُملة المنصوص عليها في الشيك لصالح المستفيد ، فلا يستطيع الساحب التصرُّفَ به ، و لا الرجوع فيه ، إلاّ بموافقة المستفيد ، لا سيما و قد استلم هذا المستفيد شيكه هذا''

(وہ رقم جو چیک میں متعین کی گئی ہے وہ بینک کے قبضے میں ہے اور اس کرنسی کے عوض جس کی صراحت چیک میں کی گئی ہے، یہ رقم اس کے پاس اس شخص کے حق میں محفوظ ہے جس کے نام کی چیک ہے، لہذا یہ بینک سے رقم نکالنے والا (چیک بنانے والا) اب اس میں اس دوسرے شخص کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف کرسکتا ہے، نہ اس سے رجوع کرسکتا ہے، خصوصاً جبکہ وہ چیک اس دوسرے شخص کے حوالے بھی کردی گئی ہے۔)

پھر دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''سلامة الشيك المصدَّق من العيوب و المخاطر التي تعرض للشيك العادي . ''

(تصدیق شدہ چیک کا ان عیوب وخطرات سے محفوظ ہونا جو سادہ چیک کو لاحق ہوتے ہیں۔)(۱)

الغرض جب مصدقہ چیک بھی ڈرافٹ کی طرح قابل اعتماد ہے اور لازمی طور پر حامل چیک کو اس سے مرقومہ رقم موصول ہوجاتی ہے تو اس پر قبضہ بھی دراصل اصل پر قبضے کی طرح ہے اور اس میں بھی بینک کے توسط کو وکالت سمجھا جائے گا اور وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہے، لہذا صرف میں بھی یہ بینک کا قبضہ موکل کا قبضہ شمار ہوکر بیع الصرف بھی جائز ہوگی۔

---

(۱) قبض الشيك هل يقوم مقام قبض النقد:۱۸

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

" والظاهر أن مثل هذا الشيک لا يختلف عن الشيک المصرفي إلا في أن المصدر في الشيک المصرفي هو البنک نفسه ، و في البنک المصدق (كذا في الأصل و هو سهو غالباً و لعله الشيک المصدق) يصدره صاحب الحساب ، و لكن مبلغه محجوز عند البنک كما كان محجوزاً في الشيک المصرفي . و ما دام أن المبلغ محجوز عند البنک ؛ فإن ما ذكرناه في الشيک المصرفي ينطبق تماماً على الشيک المصدق أيضا . "

(ظاہر یہ ہے کہ اس جیسی چیک (مصدقہ چیک) بینک ڈرافٹ سے مختلف نہیں ہے، سوائے اس کے کہ بینک ڈرافٹ تو خود بینک ہی جاری کرتا ہے، اور مصدقہ چیک وہ جاری کرتا ہے جس کا اکاؤنٹ ہوتا ہے؛ لیکن اس کی رقم بینک کے پاس محفوظ ہوتی ہے جس طرح ڈرافٹ کی صورت میں محفوظ ہوتی ہے، لہذا جب تک کہ وہ رقم بینک کے پاس محفوظ ہے ہم نے جو کچھ ڈرافٹ کے سلسلے میں بیان کیا ہے وہ مصدقہ چیک پر بھی پورے طور پر منطبق ہوتا ہے۔)(۱)

ذاتی چیک (Personal Cheque)

چیک کی تیسری قسم وہ ہے جس کو ذاتی چیک: (Personal Cheque) کہا جاتا ہے، جو آدمی کبھی خود کے لیے اور کبھی کسی کو دینے کے لیے بینک کے نام جاری کرتا ہے؛ لیکن اس میں اس بات کی کوئی توثیق نہیں ہوتی کہ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں اس قدر رقم بھی موجود ہے جو نکالی جا سکتی ہے اور نہ اس میں بینک کی جانب سے کوئی التزام ہوتا

(۱) فقه البيوع: ۴۴۷/۱

ہے کہ اس قدر رقم ادا کی جائے گی۔ ایسا چیک اگر جاری کیا گیا اور بینک کے سامنے پیش ہوا تو اگر اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے تو بینک رقم دینے کی پابند ہے، بشرطیکہ کوئی اور وجہ مانع نہ بنے، ورنہ بینک چیک کو واپس کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب اس چیک سے حامل چیک کو رقم مل جانا محتمل ہے اور یقینی نہیں، تو اس پر قبضے کو اصل رقم پر قبضہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لہذا سادہ چیک ان معاملات میں جہاں قبضے کی شرط ہے جیسے بیع الصرف، اس میں استعمال نہیں کی جا سکتی اور اس کو قبضہ نہیں مانا جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی بینک وکیل ہے اور اس کا قبضہ اصل کا قبضہ ہے تو عرض ہے کہ یہاں ایسا نہیں ہے؛ کیوں کہ بینک نے خود اس کو دینے کا کوئی التزام نہیں کیا ہے اور اس قدر رقم اس کے اکاؤنٹ میں ہے یا نہیں، اس کی کوئی تصدیق نہیں ہے اور یہاں بینک اس رقم کی ادائیگی سے انکار کر سکتا ہے، لہذا یہاں وکالت والی وہ صورت نہیں پائی جاتی۔

اب رہا یہ سوال کہ غیر مصدقہ چیک کی صورت فقہی لحاظ سے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو بعض علما نے حوالے کا درجہ دیا ہے؛ لہذا یہاں چیک جاری کرنے والا اس قدر رقم کو بینک پر حوالہ کرتا ہے، اس لیے چیک جاری کرنے والا محیل اور وہ شخص جس کو رقم دینا ہے وہ محتال اور بینک محتال علیہ ہے۔

مگر یہاں ایک بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ حوالے میں لازم ہے کہ حوالے کے تینوں اطراف یعنی محیل، محتال اور محتال علیہ سب راضی ہوں ورنہ حوالہ تام نہیں ہوتا اور بالخصوص محتال علیہ کا راضی ہونا شرط ہے؛ مگر یہاں بینک اس حوالے سے راضی نہیں ہوتا، تو یہ حوالہ تام نہ ہوا؟

چناں چہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"أَمَّا رُكْنُ الْحَوَالَةِ فَهُوَ الْإِيجَابُ وَالْقَبُولُ ، الْإِيجَابُ مِنْ الْمُحِيلِ ، وَالْقَبُولُ مِنْ الْمُحَالِ عَلَيْهِ وَالْمُحَالِ جَمِيعًا ، فَالْإِيجَابُ: أَنْ يَقُولَ الْمُحِيلُ لِلطَّالِبِ: أَحَلْتُكَ عَلَى فُلَانٍ هَكَذَا،

وَالْقَبُولُ مِنَ الْمُحَالِ عَلَيْهِ وَالْمُحَالِ أَنْ يَقُولَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا: قَبِلْتُ أَوْ رَضِيتُ ، أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ مِمَّا يَدُلُّ عَلَى الْقَبُولِ وَالرِّضَا ، وَهَذَا عِنْدَ أَصْحَابِنَا."

(اور رہے حوالے کے ارکان تو وہ ایجاب وقبول ہیں، ایجاب محیل کی جانب سے اور قبول محال علیہ اور محال دونوں کی جانب سے، پس ایجاب یہ ہے کہ محیل مطالبہ کرنے والے سے کہے کہ میں نے تجھے فلاں کے حوالے کر دیا اور قبول کرنے والے محال علیہ اور محال میں سے ہر ایک کہے کہ میں نے قبول کیا یا کہے کہ میں راضی ہوا یا اس جیسی بات جو قبول و رضا پر دلالت کرے، یہ ہمارے اصحاب کے نزدیک ہے۔)(۱)

لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہاں بینک راضی نہیں جو کہ محتال علیہ ہے تو یہ حوالہ کیسے صحیح ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حوالے میں محتال علیہ کا راضی ہونا ایک اختلافی مسئلہ ہے، امام شافعی و امام مالک اور امام احمد - رحمہم اللہ - کے نزدیک محتال علیہ (جیسے یہاں بینک ہے) کا راضی ہونا لازم نہیں ہے، بشرطے کہ اس پر محیل کا دین و قرضہ ہو، مثلاً زید کا قرضہ خالد پر تھا اور خالد کا قرضہ عابد پر تھا تو خالد زید کا قرضہ عابد پر حوالہ کر دے تو یہ جائز ہے، خواہ اس سے عابد راضی ہو یا نہ ہو۔(۲)

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ حوالے کی دو قسمیں ہیں: مطلقہ اور مقیدہ، مطلقہ یہ ہے کہ محتال علیہ پر محیل کا کوئی دین نہ ہو اور مقیدہ یہ ہے کہ محتال علیہ کے ذمہ محیل کا کوئی دین ہو۔ علمائے شافعیہ و حنابلہ و مالکیہ کے نزدیک حوالہ مطلقہ جائز نہیں ہے، صرف حوالہ مقیدہ جائز ہے جس کی صورت یہ ہے کہ محتال علیہ پر محیل کا قرضہ ہو تو وہ محتال علیہ پر اپنے قرض دہندہ کا حوالہ کر سکتا ہے خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو۔

---

(۱) بدائع الصنائع:۶/۱۵

(۲) المغني لابن قدامة:۵/۶۰

شوافع کی کتاب "تکملة المجموع شرح المهذب" میں ہے:

"إذا كانَ لِرَجُلٍ على رجُلٍ حَقٌّ، فأحَالَه على مَن لا حَقَّ عليه، فإن لم يَقْبَل المُحَالُ عليه الحوالةَ لم تَصِح الحوالةُ، و لم يبرأ المُحِيل؛ لأنَّه لا يَسْتَحِقّ شيئاً على المُحَال عليه."

(اگر ایک شخص کا دوسرے پر حق تھا اور اس نے اسے ایک ایسے شخص کے حوالے کیا جس پر کوئی حق نہیں تھا تو اگر محال علیہ اس کو قبول نہ کرے تو حوالہ صحیح نہ ہوگا اور نہ محیل اس سے بری ہوگا؛ کیوں کہ یہ شخص محال علیہ پر کسی چیز کا استحقاق نہیں رکھتا۔ (۱)

حنبلی مذہب کے مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ نے "المغني" میں لکھا:

"الشَّرْطُ الثَّانِي، أَنْ تَكُونَ عَلَى دَيْنٍ مُسْتَقِرٍّ. وَلَا يُعْتَبَرُ أَنْ يُحِيلَ بِدَيْنٍ غَيْرِ مُسْتَقِرٍّ."

(دوسری شرط یہ ہے کہ حوالہ کسی ایسی دین پر ہونا چاہیے جو دوسرے کے ذمہ مقرر ہو اور ایسے دین پر حوالہ کیا جانا معتبر نہیں جو غیر مستقر ہو۔) (۲)

فقہ حنبلی کی مستند کتاب "الروض المربع" میں ہے:

"و لا تَصِحُّ الحوالةُ إلاّ على دَينٍ مُسْتَقِرٍّ؛ إذْ مُقتضَاهَا إلزامُ المُحَالِ عليه بالدَّيْن مُطلقًا، و مَا لَيْسَ بِمُسْتَقِرٍّ عرضةٌ للسُّقُوط، فلا تَصِحّ على مال كتابةٍ، أو سَلَمٍ، أو صَدَاقٍ قبلَ دخولٍ، أو ثَمَن مدةِ خِيَارٍ، و نحوها، و إن أحَالَه على مَن لا دَيْنَ عليه فهي وَكَالَةٌ."

(۱) تکملة المجموع: ۳۱/۴۳۱

(۲) المغني: ۵/۵۵

(حوالہ صحیح نہیں ہوتا؛ مگر ایسے دین پر جو مقرر ہو؛ کیوں کہ حوالہ کا مقتضی محال علیہ پر مطلقاً دین کو لازم کرنا ہے اور جو اس کے ذمہ مقرر نہ ہو وہ ساقط ہونے کی زد میں ہوتا ہے، لہذا مال کتابت، بدل سلم اور دخول سے پہلے مہر کی رقم یا مدت خیار میں ثمن پر حوالہ کرنا صحیح نہیں اور اگر اس پر حوالہ کیا جس پر دین نہیں ہے تو وہ وکالت ہے۔)(۱)

اسی طرح "منار السبیل" میں لکھا ہے:

"الثالث: استقرارُ المَالِ المُحَالَ عليه، نص عليه، لأنّ مقتضاها إلزامُ المُحال عليه بالدين مطلقاً، وما ليس بمُستَقِرٍّ عرضةٌ للسُّقُوط، فلا تَصِحّ على مال كتابةٍ، أو صداقٍ قبل دخولٍ، أو ثمن مدة خيارٍ، أو جُعْلٍ قبل العَمَل."

(تیسری شرط: مال کا محال علیہ پر مقرر ہونا، امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے، وجہ یہ کہ حوالہ کا مقتضی محال علیہ پر مطلقاً دین کو لازم کرنا ہے اور جو اس کے ذمہ مقرر نہ ہو وہ ساقط ہونے کی زد میں ہوتا ہے؛ لہذا مال کتابت اور دخول سے پہلے مہر کی رقم پر یا مدت خیار میں ثمن پر یا کام پورا ہونے سے پہلے اجرت کی رقم پر حوالہ کرنا صحیح نہیں۔)(۲)

اور فقہ مالکی کی معروف کتاب "الشرح الكبير" للعلامہ الدردیر میں ہے:

"(شرطُ صِحّة الحوالة رضا المُحِيْل والمُحَال فقط)لا المحال عليه على المشهور، و لا يُشْتَرَطُ حُضُورُه، و إقرارُه على أحَدِ القَوْلَيْن المُرَجَّحَيْنِ، و الثاني يُشْتَرَطُ (و ثبوتُ دَيْنٍ) للمُحِيْل في ذمَّةِ المُحَال عليه."

---

(۱) الروض المربع: ۲۱۸

(۲) منار السبیل: ۱/۳۶۵

(حوالے کے صحیح ہونے کی شرط مشہور قول پر صرف محیل اور محال کا راضی ہونا ہے، نہ کہ محال علیہ کا راضی ہونا اور نہ اس کا حاضر ہونا اور نہ اس کا اقرار کرنا شرط ہے ان دو قولوں میں سے ایک کے مطابق جن کو راجح قرار دیا گیا ہے اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شرط ہے اور (حوالے کے صحیح ہونے کی دوسری شرط) محیل کا محال علیہ کے ذمہ دین کا ثبوت ہے۔)(۱)

اسی طرح فقہ مالکی کی متعدد کتب میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حوالہ میں یہ شرط ہے کہ محیل کا دین محتال علیہ کے ذمہ ہو، ورنہ حوالہ صحیح نہ ہوگا۔(۲)

جب یہ واضح ہوگیا کہ ائمہ ثلاثہ کا مسلک یہ ہے کہ حوالہ مقیدہ جائز ہے جس میں محتال علیہ پر محیل کا قرضہ ہوتا ہے تو اب زیر بحث صورت میں بینک کے بارے میں غور کرنا ہے کہ کیا اس کے ذمہ چیک دینے والے کا قرضہ ہے؟ ظاہر ہے کہ بینک میں جب اس نے اپنا اکاؤنٹ کھلوایا ہے تو جو رقم جمع کی ہے وہ بینک کے ذمہ محض امانت نہیں ہے؛ بل کہ قرض ہے، لہٰذا ائمہ ثلاثہ کے مسلک کے مطابق اس مسئلے میں حکم یہ ہوگا کہ چیک جاری کرنے والے کی رقم اگر بینک میں جمع ہو اور اس کا اکاؤنٹ خالی نہ ہو تو یہ سادہ چیک حوالہ قرار پائے گی اور یہ معاملہ جائز ہوگا اور اگر اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود نہ ہو تو ان حضرات کے مسلک کے مطابق بھی یہ حوالہ درست نہ ہوگا، کیوں کہ بینک (جو کہ محتال علیہ ہے) کے ذمہ چیک جاری کرنے والی کی کوئی رقم نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس سلسلے میں اپنی کتاب ''فقہ البیوع'' میں جو لکھا ہے ہم نے اسی کی وضاحت حوالوں کے ساتھ یہاں کر دی ہے۔ حضرت مولانا کی عبارت اس

(۱) الشرح الكبير مع حاشية الدسوقي:۳/۳۲۵

(۲) دیکھئے:أقرب السالک لمذهب مالک:۱۰۷،الذخيرة للإمام القرافي:۹/۲۵۳،جامع الأمهات لابن الحاجب :۱/۲۷۲،الكافي في فقه أهل المدينة لابن عبد البر :۴۰۱،حاشية الصاوي على الشرح الصغير:۳/۴۲۴

سلسلے میں یہ ہے:

”و حقيقة هذه العملية فقهاً أن المشتري يحيل البائع على بنكه ، وهو محيل و البائع محتال و البنك محال عليه۔ فإن رضى البائع بقبول الشيك حصل به رضا المحيل و المحتال ، أما البنك فلم يرض بهذه الحوالة بعد، فتمت الحوالة عند من لا يشترط رضا المحتال عليه لصحة الحوالة وهم الحنابلة والمالكية والشافعية في الراجح من مذهبهم ، ولكن تصح الحوالة عندهم بشرط أن يكون لمصدر الشيك رصيد قابل للسحب بقدر مبلغ الشيك ؛ فإن الحوالة عندهم مقيدة دائماً بدين المحيل على المحال عليه .“

(فقہی لحاظ سے اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ خریدار بائع کو بینک کے حوالے کر رہا ہے اور وہ محیل ہے اور بائع محال اور بینک محال علیہ ہے، پس اگر بائع چیک کے قبول کرنے پر راضی ہو گیا تو محیل اور محال کی رضا حاصل ہو گئی، رہی بینک تو وہ اب تک تو اس حوالے سے راضی نہیں ہے ، لہذا یہ حوالہ ان حضرات کے نزدیک تام ہو گیا جو محال علیہ کی رضا کو صحتِ حوالہ کے لیے شرط نہیں قرار دیتے اور وہ حنابلہ، مالکیہ اور شافعیہ ہیں ان کے راجح قول کے مطابق ؛لیکن ان کے نزدیک یہ حوالہ اس شرط کے ساتھ صحیح ہو گا کہ چیک جاری کرنے والے کے پاس اکاؤنٹ میں اس قدر رقم موجود ہو جتنی کہ چیک میں لکھی ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک حوالہ ہمیشہ محیل کے دین کے ساتھ مقید ہوتا ہے جو محال علیہ کے ذمہ ہو۔)(۱)

ہاں یہ سوال یہاں باقی رہ جاتا ہے کہ عند الحنفیہ یہ معاملہ جائز نہ ہوا ؛ کیوں کہ ان

(۱) فقه البيوع:۱/۴۴۸

حضرات کے نزدیک حوالے میں محتال علیہ کی رضا لازم ہے، تو حضرت مولانا نے اس اشکال کے حل کی یہ صورت بیان کی ہے کہ چیک کے جاری کرنے کے وقت تو یہ حوالہ نامکمل ہوگا ؛لیکن جب چیک پیش کرنے پر بینک اس کو قبول کرلے گا تو حوالہ مکمل ہو جائے گا اور چیک کے حامل کو بطریق حوالہ رقم وصول ہو جائے گی۔(۱)

الغرض جب یہ واضح ہوا کہ یہ معاملہ حوالہ کی قبیل سے ہے اور اس کو بعض ائمہ کے مسلک کے مطابق حوالہ قرار دینے میں کوئی اشکال نہیں اور حنفیہ کے مطابق جو اشکال ہوتا ہے اس کو ایک تاویل سے ختم کیا جا سکتا ہے تو اب یہ قابل غور ہے کہ کیا سادہ چیک پر قبضہ کو شرعی قبضہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشتر حضرات فقہا وعلمانے اس کو قبضہ ماننے سے انکار کیا ہے؛ اگر چہ کہ بعض اس کو قبضہ ماننے کے قائل بھی ہیں جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

پھر یہاں ایک جماعت علما کی وہ ہے جو سادہ چیک کی دو قسمیں کرتی ہے: ایک وہ جس میں چیک کے لین دین کے دن ہی کی تاریخ ہو اور دوسری وہ جس میں آئندہ کی کوئی تاریخ ہو اور یہ فرق بیان کرنے والے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جس چیک پر آئندہ کی تاریخ ہو وہ قبضے کے حکم میں نہیں اور جس پر اسی دن کی تاریخ ہو وہ قبضے کے حکم میں ہے۔

''احکام الشیک'' کے مؤلف لکھتے ہیں:

''إنّ قَبْضَ الشِّيكِ غَيْرِ المُصَدَّق الحَالّ المَكْتُوْبِ بتاريخ اليوم و المُبَيِّن القِيْمَة بالتحديد يُعتَبرُ قَبْضاً لِمُحْتَواه بشرطِ أنْ يُرَافِقَه مِنَ القَرَائِن مَا يَدُلُّ عَلٰى وُجُودِ رَصِيْدٍ لَه لَدَى المَحْسُوْبِ عليه.''

(غیر مصدقہ چیک پر قبضہ جس پر آج کی تاریخ لکھی ہو اور قیمت کی تحدید

---

(۱) فقہ البیوع:۱/۴۴۸

کے ساتھ صراحت کردی گئی ہو، ایسی چیک پر قبضہ کو اس پر درج رقم پر قبضہ مانا جائے گا ؛ بشرطے کہ ایسے قرائن پائے جائیں جو بینک کے پاس اس کا اکاؤنٹ ہونے پر دلالت کریں۔(۱)

اور دکتور حسام الدین بن موسی عفانۃ (استاذ الفقہ والاصول ، جامعۃ القدس) اپنی کتاب "یسئلونک عن المعاملات المالیۃ" میں لکھتے ہیں:

"إذا نَظَرْنَا إلى حقيقةِ التَّعَامُل بالشيكات ، و أنّ مَنْزِلَتَها لا تَقِلُّ عن منزلةِ التعامل بالأوراق النقدية ، و إذا اشترطنا في الشيک الحلول بمعنى أن يكتب تاريخ الشيک في تاريخ المصارفة ، و أن يكون المبلغ المكتوب فيه محدّداً ؛ فإنه يجوز استعمال الشيک في هذه الحالة ، و يُعتَبرُ استلامُ الشيک بمثابة قبض المبلغ المدون فيه ، فقبض الشيک في هذه الحالة يقوم مقام قبض بدل الصرف ذاته ."

(جب ہم نظر کرتے ہیں چیکوں سے تعامل کی حقیقت پر اور اس پر کہ اس کا مقام کرنسی نوٹوں کے تعامل سے کم نہیں ہے اور جب ہم چیک میں اس کا وقت ہوجانے کی شرط لگاتے ہیں یعنی یہ شرط کہ بیع صرف جس دن ہوئی ہے اسی دن کی تاریخ لکھی جائے اور یہ کہ اس میں لکھا ہوا مبلغ متعین ہو تو اس صورت میں چیک کا استعمال جائز ہے اور چیک کے قبول کر لینے کو اس میں لکھی ہوئی رقم پر قبضے کے قائم مقام مانا جائے گا ، لہذا اس حالت میں چیک پر قبضہ خود بدل صرف پر قبضے کے قائم مقام ہوگا۔)(۲)

(۱) أحكام الشيک، دراسة فقهية:۷۸

(۲) يسئلونک عن المعاملات المالية:۱/۲۰۷

لیکن اکثر علما سادہ ذاتی چیک کو کسی بھی صورت میں قبضے کے حکم میں نہیں مانتے ؛ کیوں کہ اس چیک سے رقم پر حقیقۃ قبضہ نہیں ہوتا ، نہ خود معاملہ کرنے والے کا اور نہ اس کے کسی وکیل کا، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا؛ کیوں کہ قبضہ تو اس وقت کہا جائے گا جب اس رقم پر تصرف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور یہاں رکاوٹ ہوسکتی ہے۔

مثلاً چیک دینے والے کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود نہ ہو، یا چیک جاری کرنے والا خود بینک کو حکم جاری کردے کہ یہ چیک کیش نہ کی جائے تو ان صورتوں میں تاریخ درج ہونے کے باوجود ممکن ہے کہ حامل چیک کو رقم نہ ملے، اس لیے اکثر علما یہ کہتے ہیں کہ سادہ چیک قبضے کے حکم میں نہیں ہے، لہذا اس کو صرف کے معاملات میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) کریڈیٹ کارڈ (Credit Card) کی مختلف قسمیں اوران سے ثمن کی ادائیگی کا حکم

ثمن کی ادائیگی کی ایک جدید شکل یہ ہے کہ کریڈیٹ کارڈ سے ادائیگی کی جائے ، جس کو عربی میں ”بطاقة الائتمان“ کہا جاتا ہے اور اس کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں: جیسے کریڈیٹ کارڈ ، چارج کارڈ (Charge card)، ڈیبیٹ کارڈ (Debit card)، ویزا کارڈ (Visa card)، ماسٹر کارڈ (Master card)، امریکن ایکسپریس (American Express)، ڈنرز کلب (Diners Club)، یورو کارڈ (Euro card) وغیرہ۔ان کارڈوں کے حصول کے طریق کار اور ان کی شرائط کی تفصیل کے لحاظ سے ان کی یہ قسمیں بنتی ہیں، مگر یہاں اس وقت ہمیں نہ تو ان کارڈوں کی شرعی حیثیت سے بحث مقصود ہے اور نہ ان کی مکمل تفصیلات کو پیش کرنا مطلوب ہے؛ بل کہ صرف یہ مقصود ہے کہ ان مختلف قسم کے کارڈوں سے ثمن کی ادائیگی کا حکم کیا ہے، اور یہ کہ ان سے قبضہ متحقق ہوجائے گا یا نہیں؟

اس لحاظ سے یہاں اس کی بنیادی قسموں کا حکم بیان کرتے ہیں جن سے دیگر کارڈوں کا حکم بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

ڈیبٹ کارڈ:(DEBIT CARD)

یہ کارڈ بینک سے ان کو فراہم کیا جاتا ہے جن کا اسی بینک میں اکاؤنٹ موجود ہو اور اس سے آدمی کسی تاجر سے کوئی بھی چیز خرید سکتا ہے اور جب وہ اپنا یہ کارڈ تاجر کو دیتا ہے تو وہ مشین میں لگا کر فوری طور پر اپنے سامان کی رقم نکال لیتا ہے۔

ڈیبیٹ کارڈ سے معاملے کی تکییف فقہی میں بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ عقد کفالت ہے اور بعض نے اس کو عقد وکالت قرار دیا ہے، مگر اکثر علما کا رجحان یہ ہے کہ یہ از قبیل حوالہ ہے، اس طرح کہ جب خریدار کسی تاجر سے کوئی چیز خریدتا ہے تو اس کے ذمہ اس کی قیمت واجب ہوجاتی ہے، اور یہ اس پر دین ہے اور یہ شخص اپنا یہ قرض بینک پر حوالہ کرتا ہے اور چوں کہ یہاں بائع اس کارڈ کو قبول کر رہا ہے اس لیے وہ بھی اس معاملے سے راضی ہے، گویا یہاں محیل ومحتال ومحتال علیہ تینوں کی رضا سے یہ معاملہ ہو رہا ہے اور اس طرح کا حوالہ تمام فقہا کے نزدیک جائز ہے اور پھر اس میں چوں کہ یہ شرط ہوتی ہے کہ کارڈ والے کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود ہو، اس لیے حوالہ مقیدہ ہے جو سب کے نزدیک جائز ہے۔

مشہور ماہر اقتصادیات شیخ الصدیق الضریر لکھتے ہیں:

” و التكييفُ الصحيحُ لها: هُوَ أنَّهَا عقدُ حوالةٍ ، البنكُ مصدر البطاقة يقول لحامل البطاقة :” خُذْ هذهِ البطاقةَ ، و اشترِ بِهَا من التَّاجِر، و لا تدفع الثمن، و أحل التاجر عليَّ ، و أنا أدفع له “. و يقول مصدر البطاقة للتاجر :” بايع حامل البطاقة و أنا سأدفع لک الثمن “. و حامل البطاقة يقول للتجار : ” أحلتک على البنک المصدر هذه البطاقة بالثمن “. فإذا حصل الشراء

فقد تمَّتِ الحوالةُ مستوفيةً لأركانها وشروطها ، برضاء الأطراف الثلاثة. و بطاقة الدبت كارد(Debit Card)هذه يكون البنک (مصدر البطاقة) فيها مديناً لحامل البطاقة و هو (المحال عليه)، و حامل البطاقة هو (المحيل)، وهو مدين للتاجر (المحال)، فالحوالة هذه على مدين، وهي جائزة باتفاق الفقهاء ."

(اس کارڈ کی صحیح کیفیت یہ ہے کہ یہ عقد حوالہ ہے، (گویا ایک جانب) بینک جو کارڈ جاری کرنے والا ہے، وہ کارڈ حاصل کرنے والے سے یوں کہتا ہے کہ یہ کارڈ لو اور تاجر سے اس کے ذریعے خریدی کرو اور قیمت ادا نہ کرو اور تاجر کو میرے اوپر حوالہ کردو اور میں اس کو قیمت ادا کردوں گا اور (دوسری جانب) کارڈ جاری کرنے والا بینک تاجر سے یوں کہتا ہے کہ حامل کارڈ سے معاملہ کرلینا، میں اس کی قیمت ادا کردوں گا اور (تیسری جانب) کارڈ والا تاجر سے کہتا ہے کہ میں نے قیمت ادا کرنے کے سلسلے میں تجھے بینک پر حوالہ کردیا ہے جو اس کارڈ کا جاری کرنے والا ہے، پس جب خریدی ہوئی ان تین اطراف کی رضا وخوشی سے حوالہ اپنے تمام ارکان واشرائط کے ساتھ پورا ہو گیا اور ڈیبٹ کارڈ میں بینک حامل بطاقہ کا قرض دار ہے اور وہ یہاں محال علیہ ہے اور حامل بطاقہ محیل ہے اور وہ قرض دار ہے تاجر کا جو کہ محال ہے، لہذا یہ حوالہ دین پر ہوا جو کہ باتفاق فقہا جائز ہے۔)(۱)

اسی طرح دکتور محمد علی القری نے لکھا ہے:

"الأرجح أن العلاقة بين حامل البطاقة و التاجر (الذي يشتري منه بالبطاقة) هي حوالة ، فهو عندما يشتري سلعةً ، أو خدمةً يتعلق بذمته قيمتها ، و يكون التاجر دائنًا له بذلک

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي: عدد۲/۱جزء:۳/۶۰۳

المبلغ ، فيحيل الدائن على ملءٍ ، و هو المصدر للبطاقة ، و يُمَثِّلُ توقيعُه على الفاتورة هذه الإحالةَ ، و يقبلُ التاجرُ تلك الإحالةَ ، فيُرسِلُ الفاتورةَ إلى المُصدِر الذي يدفع له المبلغ . و من المعروف أنّهُ لا يُشْتَرَطُ لصِحَّة الحوالة أن يكون للمحيل دينٌ على المُحال عليه. و الرضا مُتوَفِّرٌ بين أطراف هذه العلاقة ، و الدينُ معلومٌ ، و هو دينٌ لازمٌ على المدين في الحال."

(راجح یہ ہے کہ حامل بطاقہ اور تاجر (جس سے وہ بطاقہ کے ذریعے خریدتا ہے ان دونوں) کے مابین تعلق حوالے کا ہے، لہذا جب وہ کوئی سامان خریدتا ہے یا کوئی خدمت یعنی سرویز لیتا ہے تو اس کے ذمہ اس کی قیمت متعلق ہو جاتی ہے اور تاجر اس کو اس قدر مبلغ قرض دیتا ہے اور وہ خریدار اس کو دوسرے قرض دار پر حوالے کرتا ہے اور وہ بینک ہے اور رسید پر دستخط کرنا اس حوالے کی نمائندگی کرتا ہے اور تاجر اس کو قبول کرتا ہے اور بینک کے پاس وہ دستخط والی رسید بھیج دیتا ہے اور بینک اس کو وہ رقم ادا کر دیتا ہے اور معروف یہ ہے کہ محیل کا قرض محال علیہ پر ہونا شرط نہیں ہے اور یہاں رضا تینوں جانبوں میں پائی جارہی ہے اور دین معلوم ہے اور وہ فی الحال ادا کرنا قرض دار پر لازم ہے۔[۱])

الغرض جب یہ معاملہ حوالے کا ہے تو اس کارڈ سے رقم ادا کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ حامل کارڈ نے اپنا قرض بینک کے حوالے کر دیا اور بینک نے اس کو قبول کر لیا کہ وہ اس کو ادا کر دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کارڈ سے رقم کی ادائیگی کیا قبضے کے حکم میں ہے؟ اس کے بارے میں علمائے عصر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک طبقہ علما کا اس کو قبضہ مانتا ہے؛ کیوں کہ

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي:عدد/۷جز اول/۳۰۶

یہاں فوری طور پر حامل کارڈ کے اکاؤنٹ سے رقم تاجر کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجاتی ہے اوراس کاپوراحساب بھی اسی وقت رسید سے معلوم ہوجاتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ وھبہ الزحیلی نے اس کو قبضہ مانا ہے اوراسی وجہ سے اس سے ''بیع الصرف'' کی صورت میں بھی قبضہ متحقق ہوجانے کا خیال ظاہر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

" ولذلک يجوزُ في هذه البطاقة شراءُ الذهب و الفضة و النقود الأخرى ؛ لأنّه يَتِمُّ فيه الوفاءُ فوراً ، و يَتِمُّ تحويلُ الثمن مباشرةً من حساب المشتري حامل البطاقة إلى حساب التاجر البائع ، فيتم القبضُ الحقيقي و الفوري ."

(اوراسی وجہ سے اس (ڈیبٹ کارڈ) سے سونے وچاندی اوردوسری کرنسی کی خریداری جائز ہے؛ کیوں کہ اس کارڈ کی صورت میں ادائیگی علی الفور ہوجاتی ہےاور قیمت کی منتقلی کارڈوالےاس خریدار کےاکاؤنٹ سے تاجر کے اکاؤنٹ میں ہاتھوں ہاتھ ہوجاتی ہے،لہذا یہاں حقیقی اورفوری قبضہ متحقق ہوجاتا ہے۔(۱)

شیخ عبداللہ بن سلیمان بن عبدالعزیز الباحوث کی بھی یہی رائے ہے،وہ''بطاقات المعاملات المالية'' میں اس سلسلے میں عدم جواز کی رائے ذکر کرنے کے بعد دوسری رائے کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"الثاني:جوازُ الشِّرَاءِ بها ؛ لأنّ شرطَ الجواز هو التقابض وقد تَحَقَّقَ التقابضُ فعلاً في هذه المسئلة عن طريق الحسم من حساب المشتري ، و الإيداع في حساب البائع آلياً في نفس اللحظة ، وهذا هو الراجح في هذه المسئلة إن شاء الله تعالى."

(۱) بطاقات الائتمان للشیخ الزحیلی:۱۴

(دوسری رائے: اس کارڈ سے خریداری کا جواز ؛ کیوں کہ (بیع الصرف کے) جواز کی شرط یعنی تقابض اس صورت میں عملاً خریدار کے اکاؤنٹ سے رقم نکال کر بائع کے اکاؤنٹ میں اسی وقت ڈال دینے سے متحقق ہوگئی اور اس مسئلے میں ان شاء اللہ یہی بات راجح ہے۔)(۱)

احقر کی رائے بھی اسی کے موافق ہے کہ یہ حوالہ ہے اور اس حوالے میں چوں کہ مجلس ہی میں فوری طور پر قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، اس لیے یہ قبضۂ شرعی و حقیقی کے حکم میں ہے؛ لہٰذا اس سے معاملات صرف بھی انجام دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم

چارج کارڈ (Charge Card)

چارج کارڈ ایک قرض کا کارڈ ہے جو بینک جاری کرتا ہے، مگر اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ کارڈ حاصل کرنے والے کا اکاؤنٹ بینک میں موجود ہو، بل کہ بینک شخصیت کی حیثیت و مقام کو دیکھ کر یہ کارڈ جاری کر دیتا ہے اور حامل کارڈ کو اس کے ذریعے یہ سہولت دیتا ہے کہ وہ اس کارڈ سے ایک مقررہ مقدار تک کی رقم سے اپنی خواہش کی چیزیں خریدے اور بعد میں اس کو ادا کرے اور جب بھی اس کے ذریعے خریدی کی جاتی ہے تو بینک اپنا کمیشن کاٹ کر بائع کو اس کی بقیہ قیمت اپنی جانب سے ادا کر دیتا ہے اور بعد میں خریدار سے وہ رقم وصول کرتا ہے۔ اس کارڈ میں عام طور پر ایک مختصر مدت حامل کارڈ کو دی جاتی ہے؛ تا کہ اس مدت میں وہ بینک کا یہ قرضہ ادا کر دے، مثلاً ایک ماہ یا دو ماہ وغیرہ، اگر اس مدت میں اس نے وہ رقم بینک کو ادا کر دی تو بینک اس سے کوئی زائد رقم وصول نہیں کرتا اور اگر مدت مقررہ میں ادا نہ کرے تو بینک اس پر زائد رقم وصول کرتا ہے۔ اور اسی لیے علماء میں سے اکثر حضرات اس کارڈ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ اس میں سود میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

---

(۱) بطاقات المعاملات المالية: ۳۵

❁ کریڈیٹ کارڈ(Credit Card)

یہ کارڈ بھی بینک جاری کرتا ہے اور اس میں بھی اکاؤنٹ کا ہونا لازم نہیں ؛ بل کہ بغیر اکاؤنٹ بھی اس کو جاری کردیا جاتا ہے۔اس کارڈ اور چارج کارڈ میں بنیادی کوئی فرق نہیں ،صرف یہ فرق ہے کہ چارج کارڈ میں مختصر مدت کے لیے قرض فراہم کیا جاتا ہے اور وہ یک مشت ادا کرنا ہوتا ہے، جب کہ کریڈیٹ کارڈ میں مدت بھی لمبی ہوتی ہے اور قرض بھی زیادہ دیا جاتا ہے اور اس کی ادائیگی قسط وار کی جاسکتی ہے۔

اور ان دونوں کے استعمال کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ خریدار کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے تو تاجر کے پاس اپنا کارڈ (کریڈیٹ کارڈ یا چارج کارڈ) پیش کرتا ہے اور وہ اس کی ضروری تحقیق و جانچ کے بعد خریدی ہوئی اشیاء کا بل بنا کر اس کارڈ کو مشین میں لگاتا ہے اور اس میں مذکورہ رقم کا اندراج کرتا ہے، جس پر اس کو رسید اسی مشین سے حاصل ہو جاتی ہے اور وہ خریدار کا اس پر دستخط کرا کر ایک اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسرا خریدار کو دیدیتا ہے، پھر وہ اس رسید کو متعلقہ بینک کو بھیج کر اپنی رقم وصول کر لیتا ہے جو اس کو بینک اپنا کمیشن کاٹنے کے بعد دیدیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کارڈوں۔''چارج کارڈ''اور''کریڈیٹ کارڈ'' سے ثمن کی ادائیگی کیا قبضہ کہلائے گی؟ اور کیا اس سے بیع الصرف میں بھی کام لیا جاسکتا ہے؟

اس میں علما کے مابین اختلاف ہے،بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خریدار جب رسید پر دستخط کر دیتا ہے تو اسی وقت اس کی ذمہ داری بینک پر آجاتی ہے اور اب معاملہ تاجر اور بینک کے مابین رہ جاتا ہے،لہذا اس کارروائی سے یہ سمجھا جائے گا کہ رقم پر تاجر کو قبضۂ حکمی حاصل ہو گیا، پھر ان میں بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف کے معاملات میں بھی یہ قبضہ کافی ہو جاتا ہے۔

یہی رائے علامہ شیخ عبداللہ المنیع کی ہے،وہ اپنی کتاب ''**بحوث في الاقتصاد الاسلامی**''میں فرماتے ہیں:

”و أمَّا شِرَاءُ الذَّهَب بِبِطَاقَة الائتمان ، فنظراً إلى أنّ بطاقةَ الائتمان تُعْتَبَرُ مُبْرِءَةً للذمة براءةً كاملةً بين المُتَصَارِفِيْن ، وحقُّ بائع الذهب بموجب بطاقة الائتمان ثابتٌ كثُبُوتِ حَقِّه في الشيک المُصَدَّق من حيث إن صاحبَ البطاقة حينما يُوَقِّعُ بموجبها على فاتورة الدفع لا يستطيعُ الرجوعَ في توقيعه ، ولا يستطيعُ مُصْدِرُ البِطَاقَةِ أن يتأخّر عن سداد القيمة عند الطلب مهما كانتْ حال صاحب البطاقة ، ونظراً لهذا فإنَّ القولَ بصحة المصارفة ببطاقة الائتمان قولٌ وجيهٌ يُؤَيِّدُه أن معنى القبض مُتَوَفِّرٌ فيها ؛ حيث يتفرق المصارفان بموجبها وليس بينهما شيء . ومع هذا فالمسألةُ في حاجةٍ إلى مزيدٍ من النظر والتأمل في ضوء التصور لحقيقة البطاقة الائتمانية. والله المستعان.“

(اور رہا سونے وچاندی کا کریڈیٹ کارڈ سے خریدنا تو اس بات کی جانب نظر کرتے ہوئے کہ کریڈیٹ کارڈ تاجروں کے درمیان مکمل طور پر براءت ذمہ سمجھا جاتا ہے اور سونا بیچنے والے کا حق کریڈیٹ کارڈ کی وجہ سے اسی طرح ثابت ہے جس طرح اس کا حق تصدیق شدہ چیک کی صورت میں ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ کارڈ والا جب رسید پر دستخط کر دیتا ہے تو اپنے دستخط سے رجوع نہیں کرسکتا اور نہ بینک کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ تاجر کی جانب سے مطالبے کے وقت قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کرے، خواہ کارڈ والے کا جو کچھ بھی حال ہو، اس طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا کہ کریڈیٹ کارڈ سے بیع الصرف صحیح ہے لائق قبول بات ہے، جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قبضے کا معنی اس میں پایا

جا تا ہے، اس طرح کہ یہ لین دین کرنے والے جب جدا ہوتے ہیں تو ان کے مابین کچھ باقی نہیں رہتا۔ تاہم مسئلہ ابھی بھی کریڈیٹ کارڈ کی حقیقت کے سلسلے میں مزید غور وفکر کا محتاج ہے)(۱)

اور دکتور نزیہ کمال حماد نے اپنی بحث میں لکھا ہے:

"فإذا قَبَضَ مُشتَرِي الذهب ، أو الفضة ما اشتراه منها في المجلس ، و دفع إليه ببطاقة الائتمان ، فيُعْتَبَرُ التقابضُ المطلوبُ في البدلين مُتَحَقَّقاً ؛ لأنّ تسلم البائع قسيمةَ الدفع المُوَقَّعَة من حامل البطاقة قبضٌ حكميٌّ لقيمتها ، كقبض الشيک المصدَّق الذي أفتٰى " مجمعُ الفقهِ الإسلامي" بجواز شراء الذهب والفضة به على أن يتم التقابض في المجلس ؛ بل هو أقوى منه كما أفاد الفَنِّيُّون ؛ لأنّها ملزمة للتاجر، و تبرأ بها ذمة حامل البطاقة من الدين حالاً تجاهه ، و ليس له الاعتراض على الوفاء بها .أضف إلى ذلک أنه عند تمرير البطاقة على الجهاز الآلي ، يقوم على الفور بقراءة شريط المعلومات فيها، وتوصيل هذه المعلومات إلى الحاسب الآلي في البنک المُصْدِر ، الذي يتولّٰى في الحال قيد المبلغ على حساب العميل ، و تحويل المبلغ إلى حساب التاجر."

(پس جب سونا چاندی خریدنے والا سونے و چاندی کی وہ مقدار اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اور کریڈیٹ کارڈ کے ذریعے قیمت بائع کو دیتا ہے تو بدلین پر قبضۂ مطلوبہ متحقق ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ بائع کا رسید کو حاصل کر لینا

(۱) بحوث في الاقتصاد الاسلامی:۳۲۷

جس پر حامل کارڈ کے دستخط ہو چکے ہوں، یہ اس کی قیمت کا حکمی قبضہ ہے، جیسے ''مصدقہ چیک'' (Certified cheque) اس کے ذریعے سونے وچاندی کی بیع کو ''مجمع الفقہ الاسلامی'' نے جائز قرار دیا ہے۔ جب کہ مجلس میں قبضہ مکمل ہو جائے؛ بل کہ یہ تو اس سے بھی قوی ہے جیسا کہ اہل فن نے بیان کیا ہے؛ کیوں کہ یہ تاجر کے حق میں قیمت کو لازم کرنے والا اور کارڈ والے کو دین کی ذمہ داری سے اسی وقت بری کرنے والا ہے اور تاجر کو اس کارڈ سے ادائیگی پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ مزید یہ بھی ملا لیجئے کہ جونہی کارڈ کو مشین پر سے گزارا جاتا ہے تو علی الفور کارڈ میں درج معلومات کو پڑھنے لگتا ہے اور ان معلومات کو بینک میں موجود کمپیوٹر کو بھیج دیتا ہے جو کارڈ والے کے اکاؤنٹ میں مبلغ کو درج کرنے اور تاجر کے اکاؤنٹ میں وہ رقم منتقل کرنے کا ذمہ دار ہے۔(۱)

اور شیخ علاء الدین بن عبدالرزاق الجنکو نے اپنی کتاب ''التقابض في الفقه الاسلامي و أثره على البيوع المعاصرة'' میں اسی نظریے کی تائید کی ہے۔(۲)

اسی طرح ''بيت التمويل الكويتي'' سے جو اس سلسلے کی بحث علما کے درمیان ہوئی ہے اس میں بھی اسی کو اختیار کرتے ہوئے سونے وچاندی یعنی معاملات صرف کے ان کارڈوں کے ذریعے انجام دہی کا شرعی حکم بیان کیا ہے:

''و يُعتبَرُ مُسْتَنَدُ البيع (قسيمةُ الدفع) الذي يُوَقِّعُ عليه العميلُ حاملُ بطاقةِ '' فيزا التمويل '' وسيلةَ دفع مُؤَكَّدَة ، و يصرف فورًا حال تقديمه إلى بنك التاجر شريطة أن تكون

(۱) قضايا فقهية معاصرة:۱۶۰، مجلة مجمع الفقه الإسلامي: عدد/۱۲جزء:۳/۵۱۷

(۲) التقابض في الفقه الإسلامي:۲۷۰

إجراء ات البيع و البطاقة سليمةً ، كالتأكُّدِ من توقيع العميل ، و صلاحيةِ البِطَاقة ، و الحُصُولِ على التفويض اللازم ، و ما إلى ذلک من أمُوْرٍ. و بِمَا أنَّ قسيمةَ الدفع تُخَوِّلُ التاجرَ الحصولَ على المبلغ فورًا عند تقديمها للبَنْک الذي يتعامل معه التاجرُ، فإنّ ذلک يُحَقِّقُ شرطَ التَّقابُضِ في بيع الذهب و الفضة ويُعْتَبَرُ كالدفع بالشيكات و هو جائز شرعًا."

(او چر یا رسید جس پر ویزا کارڈ والا عمیل دستخط کرتا ہے، اسے ادائیگی کا ایک معتبر ذریعہ سمجھا جائے گا اور یہ کارڈ تاجر کی بینک میں جونہی پیش کیا جائے گا اسی وقت کیش ہو جائے گا، بشرطے کہ بیع اور کارڈ کی تمام کارروائیاں صحیح سالم ہوں جیسے عمیل کا دستخط اور کارڈ کی مدت اور جو اختیار دیا گیا ہے اس کا حاصل ہو جانا وغیرہ امور اور اس وجہ سے کہ یہ دستخط شدہ رسید تاجر کو اپنا مبلغ بینک سے جس سے کہ وہ معاملہ کرتا ہے، فوری طور پر حاصل کرنے کا حق دیتا ہے، اس لیے اس سے سونے و چاندی کی بیع میں تقابض کی شرط بھی متحقق ہو جاتی ہے اور یہ اسی طرح قابل اعتبار مانا جائے گا جس طرح چیک دینے کا اعتبار کیا جاتا ہے اور یہ شرعاً جائز ہے۔[1]

بل کہ "معايير الشرعية للمؤسسات المالية" کے باحثین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، چناں چہ قبضے کی صورتیں بیان کرتے ہوئے قبضۂ حکمی کی ایک صورت یہ بیان کی ہے:

"تسلُّم البائع قسيمةَ الدفْعِ المُوَقَّعَة من حامل بطاقة الائتمان (المشتري) في الحالة التي يمكن فيها المُؤسَّسَة

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي: عدد/۷جزء:۱/۲۷۳

المُصدِرَة للبطاقة أن تدفع المبلغ إلى قابل البطاقة بدون أجل."

(بائع کا رسید وصول کرلینا، جس پر کریڈیٹ کارڈ والے کی جانب سے دستخط کیا گیا ہو، جبکہ کارڈ جاری کرنے والے ادارے کو یہ ممکن ہو کہ کارڈ قبول کرنے والے تاجر کو اس قدر رقم بلا مہلت دے سکے۔)(۱)

اس سلسلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ چارج کارڈ اور کریڈیٹ کارڈ کا استعمال ''صرف'' کے معاملات میں نہیں ہوسکتا اور یہ جائز نہیں۔

علامہ صدیق الضریر، شیخ علی السالوس، شیخ مفتی تقی عثمانی وغیرہ حضرات کی یہی رائے ہے۔اور رابطۂ عالم اسلامی کے زیر سرپرستی قائم ''**مجمع الفقه الاسلامي**'' کی قرارداد: (۱۲/۲/۱۰۸) میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔(۲)

شیخ وھبہ الزحیلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" إنَّ الذَّهَبَ والفِضَّة من الأموال التي يجري فيها الربا، و يُشْتَرَطُ في شرائها و صرفها التقابضُ (يداً بيد) ولذلک لا يَصِحُّ شرائها ببطاقة الائتمان غيرِ المُغَطَّاة لتأخُّرِ سداد الثمن عن وقت العقد، و يشمل ذلک شراء سائر العُمُلات النقدية لأنّ صرفها يُشتَرَطُ فيه التقابضُ، وأنَّ بطاقةَ الخصم الشهري تعتمد على الأجل في الوفاء، ولذلک سَمَّاهَا بعضُهم (بطاقة الوفاء المؤجَّل التي يتم في نهاية الشهر) الخ."

(سونا اور چاندی ان اموال میں سے ہیں جن میں ربا اور سود جاری ہوتا ہے اور ان کی خرید وفروخت کے سلسلے میں تقابض یعنی معاملے کا ہاتھ در ہاتھ

(۱) المعايير الشرعية:۵

(۲) دیکھو: قرارات المجمع الفقه الإسلامي:۲/۳۰۵

ہونا شرط ہے اور اسی لیے ایسے کریڈیٹ کارڈ سے جس میں پہلے سے رقم بھری ہوئی نہ ہو، خریدی کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ ثمن کی بھرپائی عقد کے وقت سے متاخر ہوتی ہے اور یہی حکم تمام قسم کی کرنسیوں کی خریداری کو بھی شامل ہے؛ کیوں کہ ان میں ''صرف'' کا معاملہ کرنے کی صورت میں تقابض شرط ہے۔

اور چارج کارڈ (جس میں ایک ماہ کے اندر رقم جمع کرنا ہوتا ہے) وہ ادائیگی کے لیے ایک مدت کی شرط پر ہی جاری ہوتا ہے؛ اسی لیے بعض نے اس کا نام ''بطاقة الوفاء المؤجل'' رکھا ہے جس میں ماہ کے اخیر میں ادائیگی ہوتی ہے۔(۱)

اور رہا پہلا نظریہ تو متعدد حضرات علما نے اس کو رد کردیا ہے، جن میں سے شیخ صدیق الضریر بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''صَدَرَتْ بعضُ الفتاوی بجواز استعمال البطاقة في شراء الذهب و الفضة من التجار مُعْتَمِدَةً على أنَّ قسيمةَ الدَّفْعِ التي يُوَقِّعُ عليها العميلُ حاملُ البطاقة تُعْتَبَرُ وسيلةَ دفع مؤكَّدَة تصرف فوراً حال تقديمها إلى البنک التاجر ، لهذا فهي تُخَوِّلُ التاجرَ الحصولَ على المبلغ فوراً مما يحقق شرطُ التقابض في بيع الذهب والفضة ، و يُعْتَبَرُ كالدفع بالشيكات وهو جائز شرعاً .''

'' و لا أوَافِقُ على هذهِ الفَتوٰى ؛ لأنَّ الفوريةَ المطلوبةَ شَرْعاً في شراء الذهب والفضة غيرُ مُتحَقَّقَة في الشراء بالبطاقة ؛ لأنّ حاملَ البطاقة عندما يُقَدِّمُ البطاقة للتاجر يتسلمُ الذهب ، و يُوقِّعُ

---

(۱) بطاقات الائتمان للشيخ الزحيلي:۱۵

على القسيمة ، لا يدفعُ الثمن للتاجر ، و الذي يدفع الثمن للتاجر هـو بـنـكُ التاجر ، أو البنكُ المُصْدِرُ للبطاقة عندما يُقدِّمُ التاجرُ إليهما القسيمةَ بعد فترةٍ يتفق عليها ، وهذه الفترة في حالة بنك التاجر تَصِلُ إلى ثلاثة أيام من تسلمه قسيمة البيع ."

(بعض فتاوی اس کارڈ سے سونے و چاندی کی خریداری کے جواز پر صادر ہوئے ہیں، اس دلیل کی بنیاد پر کہ او چر یا رسید جس پر ویزا کارڈ والا عمیل دستخط کرتا ہے، وہ ادائیگی کا ایک معتبر ذریعہ ہے اور یہ کارڈ تاجر کی بینک میں جونہی پیش کیا جائے گا اسی وقت کیش ہو جائے گا، لہذا یہ دستخط شدہ رسید تاجر کو اپنا مبلغ بینک سے جس سے کہ وہ معاملہ کرتا ہے، فوری طور پر حاصل کرنے کا حق دیتا ہے، اس لیے اس سے سونے و چاندی کی بیع میں تقابض کی شرط بھی متحقق ہو جاتی ہے اور یہ مصدقہ چیک سے خریداری کی طرح ہے اور یہ شرعا جائز ہے۔

لیکن مجھے اس فتوے سے اتفاق نہیں ہے؛ کیوں کہ سونے و چاندی کی خرید وفروخت میں جس فوریت کا مطالبہ ہے وہ کریڈیٹ کارڈ سے خریداری میں متحقق نہیں ہے؛ کیوں کہ کاڑد والا شخص جب تاجر کو وہ کارڈ پیش کرتا ہے تو وہ اسی وقت سونا لے لیتا ہے اور او چر پر دستخط کر دیتا ہے، قیمت تاجر کو ادا نہیں کرتا اور تاجر کو قیمت ادا کرنے والا تاجر کا بینک ہوتا ہے، یا وہ بینک جو کارڈ جاری کرنے والا ہے، یہ بینک تاجر کو اس وقت قیمت دیتا ہے جب وہ ایک مدت کے بعد او چر اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ مدت تاجر کی بینک ہونے کی صورت میں او چر پیش کرنے سے تین دن تک ہوتی ہے۔(۱)

اسی طرح حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی اس سے اختلاف کیا ہے، انھوں

(۱) مجلة الفقه الاسلامي: عدد/۱۲ جز:۳/ ۶۱۲

نے جوفرمایا ہے،اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خریدار جب رسید پر دستخط کرتا ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ خریدار نے اپنا قرضہ بینک کے حوالے کر دیا اور وہ بری الذمہ ہو گیا؛ مگر اس قدر بات سے رقم پر قبضہ نہیں ہو جاتا، رقم پر قبضہ اور چیز ہے اور براءت ذمہ دوسری چیز ہے ، یہاں صرف براءت ذمہ ہوتا ہے، نہ کہ قبضہ؛ کیوں کہ خریدار نے یہاں صرف بینک پر اپنا قرضہ حوالہ کر دیا ہے اور بینک جب تک وہ ادا نہیں کرے گا اس کو قبضہ نہیں کہہ سکتے اور یہاں ڈرافٹ والی صورت منطبق نہیں ہوتی ، کیوں کہ یہاں بینک نے خریدار سے کوئی چیز وصول نہیں کی ہے، جیسا کہ ڈرافٹ میں ہوتا ہے، تا کہ یہ کہا جا سکے کہ بینک نے بائع کی جانب سے ثمن پر قبضہ کر لیا اور یہ وکیل کا قبضہ ہے اور وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہے۔ الغرض یہاں ڈرافٹ والی بات صادق نہیں آتی ۔ (۱)

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ چارج کارڈ اور کریڈیٹ کارڈ سے معاملے کی صورت میں فوری طور پر ثمن بائع کے قبضے میں نہیں جاتا ،اس لیے ان کارڈوں سے معاملہ میں قبضہ متحقق نہیں ہوتا، لہذا معاملات صرف میں ان کا استعمال درست نہیں۔

چھٹا اصول-مبیع کی سپردگی

بیع کے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح خریدار پر ثمن کی ادائیگی لازم ہے، اسی طرح فروخت کرنے والے پر مبیع (خریدی ہوئی چیز) کی خریدار کے حق میں سپردگی ضروری ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ:

" ومَنْ بَاعَ سِلْعَةً بِثَمَنٍ قِيلَ لِلْمُشْتَرِي : سَلِّمِ الثَّمَنَ أوّلاً ، فإذَا دَفَعَ الثَّمَنَ قِيلَ للبائع : سَلِّمِ المَبِيْعَ ". (۲)

---

(۱) دیکھو:فقه البیوع:۱/۴۶۴

(۲) دیکھو: الجوهرة النيرة:۲/۲۱۵، اللباب في شرح الكتاب:۱/۹۳

(جو شخص ثمن کے بدلے کوئی سامان خردے تو پہلے خریدار سے کہا جائے گا
کہ قیمت ادا کرو اور جب وہ قیمت ادا کر دے گا تو بیچنے والے سے کہا جائے گا
کہ مبیع اس کے حوالے اور اس کی قیمت ادا کر دکردو)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خریدار نے چیز کی قیمت ادا کر دی تو بائع پر لازم ہو گیا کہ وہ خردی ہوئی چیز خریدار کے حوالے کر دے اور معاملہ صاف ہو جائے ،لہذا پہلے ادا کر دیا تو کوئی حرج نہیں ۔لہذا یہاں بھی لازم ہے کہ جب خریدار کوئی بھی چیز خریدے اور اس کی قیمت ادا کر دے تو بیچنے والا اس چیز کو اس کے حوالے کر دے۔

الکٹرانک کاروبار میں مبیع کی سپردگی

الکٹرانک کاروبار میں دو طرح کی چیزیں خریدی جاتی ہیں :ایک غیر مادی چیزیں، جیسے کوئی پروگرام خریدا جائے جو خود کمپیوٹر پر ڈاون لوڈ کیا جاتا ہے، اگر ایسی چیز کو ڈاون لوڈ کر دیا تو مبیع کی سپردگی متحقق ہوگئی اور اس پر قبضہ بھی متحقق ہو گیا۔

دوسری عام مادی اشیاء، ان میں لازم ہے کہ وہ چیز کسی بھی طریق سے بائع خریدار تک پہنچائے اور چوں کہ اس میں عام طور پر یہ طے ہو جاتا ہے کہ کب اور کہاں پہنچانا ہے، لہذا اسی طے شدہ نظام کے مطابق اس کو پہنچانا اس کی ذمہ داری ہوگی۔

قبضے کی حقیقت

اب سوال یہ ہے کہ ’’ قبضے‘‘ کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟ ’’قبضے‘‘ کے لغوی معنی تو ہیں:’’تناول الشیء بجمیع الکف‘‘ (کسی چیز کو اپنے پورے ہاتھ سے لے لینا)، جیسے کہتے ہیں:’’قبضتُ السیف‘‘ (میں نے ہاتھ میں تلوار لی) یا کہا جاتا ہے:’’قبض المال‘‘ (اس نے مال لے لیا)۔

اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں:

”حیازۃ الشیء والتمکن منه سواء أکان مما یمکن تناوله بالید أم لم یمکن.“

(کسی چیز کو اپنی ملکیت میں لینا اور اس پر قدرت پالینا خواہ وہ ان چیزوں میں سے ہو جو ہاتھ سے لی جاسکتی ہیں یا ان میں سے ہو جن کو ہاتھ سے لینا ممکن نہ ہو۔)(۱)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے ”بدائع الصنائع“ میں لکھا ہے:

”وَالْقَبْضُ عِنْدَنَا هُوَ التَّخْلِيَةُ، وَالتَّخَلِّي وَهُوَ أَنْ يُخَلِّيَ الْبَائِعُ بَيْنَ الْمَبِيعِ وَبَيْنَ الْمُشْتَرِي بِرَفْعِ الْحَائِلِ بَيْنَهُمَا عَلَى وَجْهٍ يَتَمَكَّنُ الْمُشْتَرِي مِنَ التَّصَرُّفِ فِيهِ فَيُجْعَلُ الْبَائِعُ مُسَلِّمًا لِلْمَبِيعِ، وَالْمُشْتَرِي قَابِضًا لَهُ.“

(قبضہ ہمارے نزدیک تخلیہ کا نام ہے اور تخلیہ یہ ہے کہ بیچنے والا مبیع اور خریدار کے درمیان سے رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے۔ اس طرح راستہ صاف کردے کہ خریدار اس چیز میں تصرف پر قدرت پالے، پس اس وقت بائع کو مبیع کے سپرد کرنے والا اور خریدار کو قبضہ کرنے والا قرار دیا جائے گا۔)(۲)

اور امام سرخسی رحمہ اللہ نے المبسوط میں لکھا ہے:

”والقبض عبارۃ عن الحیازۃ، و ھو أن یصیر الشیء في حیز القابض.“

(قبضہ حیازہ کا نام ہے اور حیازہ یہ ہے کہ چیز ملکیت و قدرت میں آجائے۔)(۳)

---

(۱) الموسوعة الفقهیه:۳۲/۲۵۷

(۲) بدائع الصنائع:۴/۴۹۸

(۳) المبسوط:۱۲/۱۱۴

اور اللباب فی شرح الکتاب میں ہے:

” ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل ؛ لأن التخلية قبض حكماً ، لو مع القدرة عليه بلا كلفة.“

(پھر تسلیم یعنی سپردگی اس طرح تخلیہ کر دینے سے ہو جاتی ہے کہ اس چیز کے قبضے پر قدرت مل جائے؛ کیوں کہ تخلیہ حکما قبضہ ہے، اگر اس چیز پر بلا تکلف قدرت ہو جائے۔)(۱)

اور علامہ ابن الہمام نے ”فتح القدیر “میں ”تجرید“ کے حوالے سے فرمایا:

” تَسْلِيمُ الْمَبِيعِ أَنْ يُخَلِّيَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْمَبِيعِ عَلَى وَجْهٍ يَتَمَكَّنُ مِنْ قَبْضِهِ بِغَيْرِ حَائِلٍ .“

(مبیع کی سپردگی یہ ہے کہ خریدار اور مبیع کے درمیان راستہ صاف کر دے اس طرح کہ اس کو بغیر حائل کے اپنے قبضے میں لیا جا سکے۔)(۲)

اور علامہ ابن نجیم مصری ”البحر الرائق“ میں اور علامہ شیخی زادہ نے مجمع الانہر میں بحوالہ تجرید تحریر فرمایا کہ:

”وَأَمَّا مَا يَصِيرُ بِهِ قَابِضًا حَقِيقَةً فَفِي التَّجْرِيدِ تَسْلِيمُ الْمَبِيعِ أَنْ يُخَلِّيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْمَبِيعِ عَلَى وَجْهٍ يَتَمَكَّنُ مِنْ قَبْضِهِ بِغَيْرِ حَائِلٍ“

(رہی یہ بات کہ کس چیز سے حقیقۃً آدمی قابض ہوگا تو تجرید میں لکھا ہے کہ مبیع کی سپردگی یہ ہے کہ خریدار اور مبیع کے درمیان راستہ صاف کر دے اس طرح کہ اس کو بغیر حائل کے اپنے قبضے میں لیا جا سکے۔)(۳)

---

(۱) اللباب شرح الکتاب:۱۴۴

(۲) فتح القدیر:۶/۲۹۷

(۳) البحر الرائق:۵/۳۳۲، مجمع الأنھر:۳/۳۲

حاصل یہ ہے کہ قبضہ نام ہے کسی بھی چیز پر اختیار وتصرف کے حاصل ہو جانے کا، جس کی وجہ سے انسان اس چیز میں بلا کسی مانع کے تصرف کر سکے۔

قبضے کی اقسام اور صورتیں

پھر یہ بات بھی فقہائے کرام کے یہاں متفق علیہ ہے کہ قبضہ جس طرح حسی ہوتا ہے اسی طرح حکمی واعتباری بھی ہوتا ہے، نیز قبضہ جس طرح اصلی ہوتا ہے اسی طرح ضمنی بھی ہوتا ہے۔

پھر قبضہ کس صورت سے متحقق ہوتا ہے، اس میں فقہا کا کلام مختلف ہے۔

شافعیہ وحنابلہ کے یہاں قبضہ مختلف چیزوں کے لحاظ سے الگ الگ طریقہ پر ہوتا ہے۔ مکیلی وموزونی چیزوں میں کیل ووزن کر دینا قبضہ ہے اور جو چیز اندازے سے بیچی جائے اس میں اس چیز کو منتقل کر دینا قبضہ ہے اور کپڑے میں بھی اس کو منتقل کر دینا قبضہ کہلاتا ہے اور دراھم ودنانیر، روپیہ وپیسہ میں ہاتھ میں دے دینا قبضہ ہے اور جانور میں اس کی جگہ سے اس کو ہنکا دینا قبضہ ہے اور زمین میں احناف کی طرح تخلیہ کافی ہے۔

علامہ ابن قدامۃ الحنبلی رحمہ اللہ نے لکھا کہ:

" وَقَبْضُ كُلِّ شَيْءٍ بِحَسَبِهِ ، فَإِنْ كَانَ مَكِيلًا ، أَوْ مَوْزُونًا ، بِيعَ كَيْلًا ، أَوْ وَزْنًا ، فَقَبْضُهُ بِكَيْلِهِ وَوَزْنِهِ .وَ بِهَذَا قَالَ الشَّافِعِيُّ، وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ: التَّخْلِيَةُ فِي ذَلِكَ قَبْضٌ ."

(ہر چیز کا قبضہ اس کے لحاظ سے ہوتا ہے، پس اگر کوئی ناپی جانے والی یا تولی جانے والی چیز ہو تو اس کو تول کر یا ناپ کر بیچا جائے گا؛ لہذا ان کا قبضہ تولنے اور ناپنے سے ہوگا اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تخلیہ ہی ان میں قبضہ شمار ہوگا۔ (۱)

لیکن امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرح ہے کہ تخلیہ مع

(۱) المغنی: ۱۸٦/٦

التمییز سے ہر چیز میں قبضہ متحقق ہوجاتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" وَقَدْ رَوَى أَبُو الْخَطَّابِ عَنْ أَحْمَدَ رِوَايَةً أُخْرَى ، أَنَّ الْقَبْضَ فِي كُلِّ شَيْءٍ بِالتَّخْلِيَةِ مَعَ التَّمْيِيزِ ؛ لِأَنَّهُ خَلَّى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْمَبِيعِ مِنْ غَيْرِ حَائِلٍ ، فَكَانَ قَبْضًا لَهُ ، كَالْعَقَارِ ."

(اور ابوالخطاب نے امام احمد رحمہ اللہ سے ایک دوسری روایت یہ نقل کی کہ قبضہ ہر چیز میں تخلیہ سے ہوجاتا ہے جبکہ چیز ممتاز ہوجاتی ہو؛ کیوں کہ بائع نے خریدار اور مبیع کے درمیان بلا کسی حائل کے راستہ صاف کردیا، لہذا یہ قبضہ کرنے والا شمار ہوگا جیسے جائیداد میں ہے۔)(۱)

پھر امام ابن قدامہ نے وہ تفصیل درج کی ہے جو اوپر نقل کی گئی کہ کس چیز میں قبضہ کس طرح شمار کیا جاتا ہے۔

علامہ عز الدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ نے بھی اپنی "قواعد الاحکام" میں اسی قسم کی تفصیل بلا اختلاف ذکر کی ہے، وہ قبضے کی صورتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" أحدُها: المُناولةُ فيما جَرتِ العَادةُ بمُناوَلته كالحُلِي و الجَوَاهر: النوعُ الثَّاني: ما لا يُمكنُ نقلُه كالعِقَار، و إقباضُه بتمكين القابض من المُقْبِضِ مع إزالة يد المُقْبِض وتمكُّن القَابِضِ من القبض. النوعُ الثَّالثُ: مَا جرت العَادةُ بنقلِه وهو ضربان: أحدُهُمَا ما يستحق كيله أو وزنه ، فقبضُه بكَيْلِ مَكِيْلِه ووَزْنِ مَوْزُوْنِه ، ثم نَقْلِه بعد تقديره. الضربُ الثاني: ما جرت العادةُ بنَقْلِه من غيرِ كيلٍ ، و لا وزنٍ ، كالمَتَاع و النحاس و

(۱) المغني: ۱۸۷-۱۷۶/۶

الرَّصَاص و نحوها ، فقبضُه بنقله إلى مكانٍ لا يـختصُّ ببَائِعِه ، و لا تـكـفـي فيه التخلية على الأصح. النوعُ الرَّابعُ: الثِّمَارُ على الأشجار إذا أينعتْ ، و بدا صَلاحُها ، والأصح أن تـخليتها قبضٌ لها."

(ایک صورت یہ ہے کہ جن چیزوں میں مناولہ (ہاتھ سے لے لینے) کی عادت ہے جیسے زیورات اور جواہرات، ان میں مناولہ یعنی ہاتھ سے لینا قبضہ ہے، دوسرے یہ کہ جن چیزوں کو منتقل کرنا ممکن نہ ہو، ان میں قبضہ دینے والے کا اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے قبضہ لینے والے کو قبضہ دے دینا اور قبضہ لینے والے کا قبضے پر قدرت پالینا، تیسرے وہ چیز جس کو منتقل کرنے کی عادت ہو اور اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس میں ناپ تول ضروری ہو، پس اس میں قبضہ تول دینے اور ناپ دینے سے، پھر اندازہ کر کے اس کو وہاں سے منتقل کر دینے سے ہوگا، دوسری قسم وہ ہے جس کو ناپ تول کے بغیر ہی منتقل کر دینے کی عادت ہے، جیسے عام سامان، تانبا، رانگا وغیرہ، ان کا قبضہ ان کو ایسی جگہ منتقل کر دینے سے ہوگا جو بیچنے والے سے خصوصیت نہ رکھتی ہو اور ایسی چیزوں میں اصح قول کے مطابق محض تخلیہ کافی نہ ہوگا اور چوتھے درختوں پر پھل، جب وہ پک جائیں اور ان کا فائدہ ظاہر ہو جائے تو ان میں اصح یہ ہے کہ تخلیہ ان کا قبضہ ہے۔ (۱)

امام خطابی نے "معالم السنن" میں یہی بات لکھی ہے، وہ کہتے ہیں:

" الْمَقْبُوض يَـخْتَلِف فِي الْأَشْيَاء حَسَب اِخْتِلَافهَا فِي أَنْفُسهَا وَ حَسَـب اِخْتِلَاف عَـادَات النَّاس فِيهِ: فَمِنْهَا مَا يَكُون بِأَنْ يُوضَع الْـمَبِيـع فِـي يَـد صَـاحِبـه ، وَ مِنْهَا مَا يَكُون بِالتَّخْلِيَةِ بَيْنه ، وَ بَيْن الْمُشْتَرِي ، وَ مِنْهَا مَا يَكُون بِالنَّقْلِ مِنْ مَوْضِعه ، وَ مِنْهَا مَا يَكُون

(۱) قواعد الأحكام: ۲/۲۷

بِـأَنْ يُكَال ، وَ ذَلِکَ فِيمَا يَبِيع مِنْ الْكَيْل كَيْلًا ، فَأَمَّا مَا يُبَا ع مِنْهُ جُـزَافًـا صُبْـرَـة مَـصْبُـورَة عَلَى الْأَرْض ، فَالْقَبْض فِيهِ:أَنْ يُنقَل وَ يُحَوَّل مِنْ مَكَانه."

(قبضہ کی جانے والی چیز اپنی ذات کے لحاظ سے مختلف ہونے اور لوگوں کی عادات کے مختلف ہونے ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے: پس بعض وہ ہیں جن میں قبضہ اس طرح ہوتا ہے کہ خریدنے والے کے ہاتھ میں مبیع رکھ دی جائے اور بعض وہ ہیں کہ ان میں خریدار اور مبیع کے درمیان تخلیہ کردینے سے قبضہ ہوتا ہے اور بعض وہ ہیں جنھیں اپنی جگہ سے منتقل کردینے سے قبضہ ہوتا ہے اور بعض وہ ہیں کہ ان میں ناپنے تولنے سے قبضہ ہوتا ہے اور یہ ان چیزوں کی میں ہے جن کو ناپ تول کر بیچا جاتا ہے، اور رہی وہ چیزیں جنھیں اندازے سے زمین پر ڈھیر لگا کر بیچا جاتا ہے تو ان میں قبضہ یہ ہے کہ ان کو اپنی جگہ سے منتقل کردیا جائے۔(۱)

الحاصل یہ کہ قبضہ مختلف صورتوں سے ہوسکتا ہے اور یہ ہر چیز کے حسب حال ہوتا ہے، اور اس کا مدار عرف وعادت پر ہے کہ جس صورت کو کسی چیز کے سلسلے میں قبضہ شمار کیا جاتا ہے وہ اس کا قبضہ ہے، اگر چہ کہ دوسری چیز کے سلسلے میں اس کو قبضہ شمار نہ کیا جاتا ہو۔
حنفیہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ مختلف قسم کی چیزوں میں اور صورتوں میں قبضہ کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَهُ اللهُ نے لکھا ہے:

" أَنَّ التَّـخْلِيَةَ قَبْضٌ حُكْمًا لَوْ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ بِلَا كُلْفَةٍ ؛ لَكِنَّ ذَلِکَ يَـخْتَـلِفُ بِـحَسَبِ حَالِ الْمَبِيعِ ، فَفِي نَحْوِ حِنْطَةٍ فِي بَيْتٍ مَثَلًا فَـدَفْـعُ الْـمِفْتَاحِ إذَا أَمْكَنَهُ الْفَتْحُ بِلَا كُلْفَةٍ قَبْضٌ ، وَفِي نَحْوِ

(۱) معالم السنن للخطابی:۱۳۶/۳

دَارٍ فَالْقُدْرَةُ عَلَى إِغْلاقِهَا قَبْضٌ أَيْ بِأَنْ يَكُونَ فِي الْبَلَدِ فِيمَا يَظْهَرُ، وَفِي نَحْوِ بَقَرٍ فِي مَرْعًى فَكَوْنُهُ بِحَيْثُ يُرَى وَيُشَارُ إِلَيْهِ قَبْضٌ وَفِي نَحْوِ ثَوْبٍ ، فَكَوْنُهُ بِحَيْثُ لَوْ مَدَّ يَدَهُ تَصِلُ إِلَيْهِ قَبْضٌ ، وَفِي نَحْوِ فَرَسٍ أَوْ طَيْرٍ فِي بَيْتٍ إِمْكَانُ أَخْذِهِ مِنْهُ بِلا مُعِينٍ قَبْضٌ."

(بلا شبہ تخلیہ حکما قبضہ ہے، اگر اس چیز پر بلا تکلف قدرت کے ساتھ ہو؛ لیکن یہ قبضہ مبیع کی حالت وکیفیت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، پس مثال کے طور پر گھر میں رکھی ہوئی گیہوں جیسی چیز میں گھر کی کنجی دے دینا جبکہ بلا تکلف اس کو کھول سکتا ہو یہ قبضہ ہے۔ اور گھر جیسی چیز میں اس کے مقفل کرنے کی قدرت ہو تو یہ قبضہ ہے، یعنی جبکہ وہ گھر شہر میں ہو جیسے کہ ظاہر ہے اور چراگاہ میں موجود گائے جیسی چیز میں اس کا ایسی جگہ ہونا کہ اس کو دیکھا اور اس کی جانب اشارہ کیا جا سکے قبضہ ہے اور کپڑے جیسی چیز میں اس کا اس طرح ہونا کہ اس کی جانب ہاتھ بڑھا سکے، قبضہ ہے اور گھر کے اندر کے گھوڑے یا پرندے جیسے چیز میں اس کو بلا کسی مددگار کے لے سکنا قبضہ ہے۔(۱)

درر الحکام فی شرح مجلۃ الاحکام میں قبضے کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، مثلاً:

(۱) کپڑا خریدا اور بائع نے خریدار کو قبضہ کر لینے کی اجازت دے دی اور وہ خریدار سے اتنا قریب تھا کہ وہیں سے اُٹھے بغیر اس کو لے سکتا تھا تو اس کو قبضہ مانا جائے گا اور اگر اس قدر دور تھا کہ اُٹھے بغیر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا تو یہ قبضہ نہیں شمار ہوگا۔(۲)

(۲) ایک شخص نے دو پھاٹکوں والا دروازہ خریدا یا جوتے خریدا اور بائع نے ایک پھاٹک یا ایک جوتا تو حوالے کیا، دوسرا نہیں تو اس کو قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لیے اگر یہ

---

(۱) الرد المحتار ۵۶۲/۴

(۲) درر الحکام:۲۱۶/۱

تلف ہوگا تو بائع کے مال سے ضائع سمجھا جائے گا۔(۱)

(۳) گھر خریدا جس میں بائع کا سامان موجود ہے یا کھیت خریدا جس میں بائع کی کھیتی ہے اور بائع نے کہہ دیا کہ قبضہ کرلو تو یہ قبضہ شمار نہ ہوگا جب تک کہ وہ گھر سے اپنا سامان نہ اٹھا لے الا یہ کہ بائع اپنے سامان کو پہلے اس خریدار کے پاس امانت رکھ دے پھر قبضہ دے، تو یہ درست ہے۔(۲)

(۴) گیہوں خریدا جو بائع کی بوری میں رکھی ہوئی ہے تو یہ بات مبیع پر قبضہ میں کوئی مانع نہیں، اسی طرح درخت پر پھل خریدا تو یہ بات بھی تسلیم میں مانع نہیں، اگر بائع اسی حال میں اس کو قبضہ دے تو یہ قبضہ مانا جائے گا۔(۳)

(۵) ایک شخص نے مشک میں سرکہ بیچا اور خریدار نے اس کو لے کر مشک کا منہ بند کر دیا تو یہ قبضہ سمجھا جائے گا۔(۴)

(۶) زمین خریدا اور خریدار خود اسی زمین میں تھا تو بائع کا قبضہ کر لینے کی اجازت دینا خود قبضہ مانا جائے گا اور اگر خریدار زمین سے باہر تھا تو دیکھا جائے گا، اگر وہ اتنا قریب تھا کہ اس کا دروازہ بند کرسکتا اور تالا لگا سکتا تھا تو اس کو قریب ورنہ بعید مانا جائے گا اور بعید ہونے کی صورت میں بائع کا اجازت دینا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا؛ مگر اس قدر وقت گزرنے کے بعد کہ وہ وہاں پہنچ سکے۔(۵)

(۷) جس زمین کا تالا ہو اس کی کنجی حوالے کر دینا قبضہ شمار ہوگا جبکہ وہ اسی تالے کی کنجی ہو اور اگر وہ اس کی کنجی نہ ہو تو اس کو قبضہ نہیں شمار کیا جائے گا۔(۶)

---

(۱) درر الحکام:۱/۲۱۶

(۲) درر الحکام:۱/۲۱۶

(۳) درر الحکام:۱/۲۱۷

(۴) درر الحکام:۱/۲۱۷-۲۱۸

(۵) درر الحکام:۱/۲۱۹

(۸)جانور میں قبضہ یہ ہے کہ اس کا کان یا سر وغیرہ پکڑ کر دے دے، اسی طرح اگر جانور کسی جگہ ہو تو وہاں جا کر اس کو بلا مشقت اپنے قبضے میں کر لینے کی گنجائش ہو اور بائع وہ جگہ دکھا کر کہہ دے کہ اس کو قبضہ کر لو۔(۱)

(۹)دکان پر پہنچ کر اگر خریدار نے بائع کو حکم دیا کہ یہ تول دینا یا اس کو ناپ دینا اور بائع نے اپنے برتن میں جو اسی کام کے لیے موضوع ہے، تول دیا یا ناپ دیا تو یہ بھی قبضہ شمار ہوگا اور یہ قبضہ ضمنی کہلاتا ہے؛ کیوں کہ خریدار اس سے ان چیزوں کا مالک ہو گیا؛ لہٰذا ان چیزوں کا تولنے یا ناپنے کا حکم اسی کی جانب منسوب ہوگا، اس طرح یہ قبضہ ضمنی شمار کیا جائے گا۔(۲)

(۱۰)خریدار گیہوں کی دکان پر پہنچا اور بائع کو گیہوں پیسنے کا حکم دیا تو یہ بھی قبضہ مانا جائے گا اور اس کو بھی ضمنی قبضہ کہتے ہیں۔(۳)

(۱۱)اگر بائع نے خریدار کے حکم سے مبیع کو خریدار ہی کے کسی کام میں استعمال کر دیا تو یہ بھی قبضہ سمجھا جائے گا۔(۴)

ان مثالوں سے یہ بات سمجھ میں آتی اور واضح ہوتی ہے کہ قبضہ مختلف چیزوں میں مختلف صورتوں سے اور مختلف انداز سے ہوتا ہے۔

قبضے کی مختلف صورتوں کا خلاصہ

فقہائے کرام کے مسالک کی اس تفصیل کے بعد مناسب ہے کہ ان تمام صورتوں کا خلاصہ حسب ”الموسوعة الفقهية“ لکھ دیا جائے۔”الموسوعة الفقهية“ میں حضرات فقہائے کرام کے مسالک کا خلاصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

(۱) درر الحکام:۱/۲۲۰

(۲) درر الحکام:۱/۲۲۰

(۳) درر الحکام:۱/۲۲۰

(۴) درر الحکام:۱/۲۲۱

مبیع دوقسم کی ہوسکتی ہے: غیر منقول یا منقول، غیر منقول جیسے زمین، مکان ودکان میں قبضہ باتفاق فقہاء تخلیہ وتمکن سے ہوگا۔

اور منقول اشیا میں قبضہ کے بارے میں فقہا نے اختلاف کیا ہے، جمہور فقہا نے منقولات کی الگ الگ قسمیں کی ہیں کہ

(۱) بعض وہ ہیں جو ہاتھ سے لی جاسکتی ہیں۔

(۲) بعض وہ ہیں جو ہاتھ سے نہیں لی جاسکتیں۔

پھر جو ہاتھ سے نہیں لی جاسکتیں ان کی دوقسم ہیں:

(۱) ایک وہ جن میں عقد بیع کے اندر مقدار کا اعتبار نہیں۔

(۲) دوسری وہ جن میں مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔

ان میں سے پہلی صورت جس میں عموماً ہاتھ سے قبضہ ہوتا ہے جیسے روپیہ پیسہ، کپڑے، زیورات وغیرہ تو ان میں فقہائے شافعیہ و مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک قبضہ ہاتھ سے لینے کی صورت میں ہوگا۔

دوسری صورت جس میں اشیائے منقولہ میں کوئی مقدار مطلوب ومعتبر نہیں ہوتی، جیسے سامان، برتن، چوپائے، ان میں مالکیہ کہتے ہیں کہ عرف پر مدار ہے اور شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ان میں قبضہ ان چیزوں کو منتقل کردینے سے ہوتا ہے۔

اور تیسری صورت جس میں اشیائے منقولہ میں کوئی مقدار مطلوب ومعتبر ہوتی ہے، جیسے گیہوں، چاول وغیرہ کی کوئی خاص مقدار خرید کی جائے یا کوئی عددی چیز عدد کے حساب سے لی جائے تو فقہائے شافعیہ و مالکیہ وحنابلہ تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں مقررہ مقدار کی وصولی پر قبضہ متحقق ہوگا اور شوافع اس کے ساتھ یہ بھی شرط لگاتے ہیں کہ یہ چیزیں منتقل کردی جائیں۔اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ منقولات پر قبضہ کبھی ہاتھ سے لینے کی صورت سے ہوتا ہے اور کبھی اس طرح تخلیہ کردینے سے ہوتا ہے کہ اس پر تصرف کا اختیار مل جائے۔(۱)

(۱) الموسوعة الفقهية:۲۳/۲۶۱-۲۵۹

اس سلسلے میں اولاً یہ سمجھنا ہے کہ انٹرنیٹ سے ہونے والا کاروبار یا تو ان چیزوں میں ہوگا جو خود انٹرنیٹ سے حاصل کی جاسکتی ہیں، جیسے کوئی ڈیجیٹل پروگرام، ڈیجیٹل قرآن یا کوئی حسابات وغیرہ سے متعلق سافٹ ویر وغیرہ، ایسی چیزوں کا قبضہ اس وقت شمار ہوگا جب وہ پروگرام اور سافٹ ویر نیٹ کے ذریعے وصول ہو جائے گا۔

اور اگر انٹرنیٹ سے خریداری ایسی چیزوں کی ہو جو عام ہیں، جیسے کپڑا، فریج، پنکھا، واشنگ مشین وغیرہ تو ان میں قبضے کی وہی صورت مقرر ہے جو اوپر بیان کی گئی، لہذا ایسی چیزوں کا نیٹ پر آڈر دینے کے بعد وہ چیز ان ذرائع سے حاصل ہونا چاہئے جو عادی ذرائع ہیں۔

ایک انتباہ

یہاں ایک اہم مسئلہ یہ قابل لحاظ ہے کہ بیع میں یہ بات لازم ہے کہ وقت عقد مبیع موجود ہو معدوم نہ ہو؛ کیوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز کی بیع سے منع کیا ہے جو موجود و مقبوض نہ ہو۔

مگر الکٹرانک کاروبار میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ چیز موجود و مقبوض نہیں ہوتی؛ لیکن بیچنے والا اس بھروسے بیچتا ہے کہ کہیں سے خرید کر دیدوں گا۔لہذا خریدنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ بائع کے پاس وہ چیز موجود بھی ہے یا نہیں؟ اور وہ مقدور التسلیم بھی ہے یا نہیں؟

ساتواں اصول-مبیع کا علم اور تعیین

بیع وتجارت کا ایک اصول یہ ہے کہ مبیع معلوم و متعین ہو، اگر مبیع معلوم و متعین نہ ہو، بلکہ مجہول ہو تو یہ بات صحت بیع میں خلل انداز ہوگی۔لہذا یہ لازم ہے کہ مبیع مجہول نہ ہو، ورنہ معاملہ فاسد ہوگا۔پھر یہ جہالت کبھی جنس مبیع میں ہوتی ہے اور کبھی یہ تعیین میں ہوتی ہے، جنس مبیع میں جہالت کی مثال جیسے کوئی کہے کہ جس چیز پر کنکری پڑے وہ فروخت کرتا ہوں تو یہاں مبیع کی جنس ہی نا معلوم ہے، کیونکہ کنکری کس پر پڑے گی معلوم نہیں، اور تعیین میں جہالت کی

مثال یہ ہے کہ بکری کے ریوڑ میں سے ایک کو بیچے تو یہاں اگر چہ کہ بکری کی جنس معلوم ومتعین ہے، مگر خودکونسی بکری، یہ متعین نہیں، لہذا یہاں تعیین میں جہالت ہے۔لیکن تعیین میں جہالت وہیں مضر ہے جہاں مبیع مختلف انداز کی ہوتی ہو جیسے بڑی، چھوٹی وغیرہ کا اس میں فرق ہو اور اگر کوئی فرق نہ ہو تو پھر تعیین کا نہ ہونا مضر نہیں ہے۔

اسی بنیاد پر فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر گیہوں کے ڈھیر میں سے ایک قفیز گیہوں کی خرید و فروخت جائز ہے؛ کیونکہ گیہوں کے ڈھیر کی قفیزوں میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ سب کی سب متماثل ہوا کرتی ہے؛ لیکن بکری کے ریوڑ میں سے ایک بکری، یا چند کپڑوں میں سے ایک کپڑا فروخت کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ بکری اور کپڑے متفاوت ہوا کرتے ہیں۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ:

”ولو قال: بعتکَ قفيزاً من هذه الصُّبْرَةِ صَحَّ ، وإن كان قفيزاً من صُبرةٍ مَجهُولًا ؛ لكن هذه الجهالة لا تُفْضِي إلى المُنازعَةِ ؛ لأنَّ الصُّبرة الواحدةَ مُتمَاثِلَةُ القُفُزَان ، بخلاف الشَّاةِ من القَطيع ، و ثَوْب من الأربعة ؛ لأنَّ بين شاةٍ وشاةٍ تفاوتاً فاحشاً ، و كذا بينَ ثوب و ثوب“.(۱)

جب یہ معلوم ہو گیا تو اب یہ سمجھئے کہ ”الکٹرانک کاروبار“ میں بھی دیکھا جائے گا کہ اگر مبیع معلوم اور متعین ہو تو اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی ، اور اگر مبیع کی جنس یا تعیین میں جہالت ہوگی تو یہ بیع صحیح نہ ہوگی ؛ مگر چونکہ ”الکٹرانک کاروبار“ میں بھی مبیع معلوم ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے اور یہ بھی کہ وہ کونسی ہے، لہذا یہ کاروبار بھی جائز ہے۔

بیع بالصفۃ والبرامج کا حکم

اس ضمن میں ایک اہم مسئلہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ عام طور پر الکٹرانک کاروبار

(۱) بدائع الصنائع:۲۱۶/۱

میں یہ ہوتا ہے کہ کاروباری ویب سائیٹ پر چیزوں کی مکمل تفصیلات دی ہوئی ہوتی ہیں: قیمت، صفت ونوعیت، سائز وحجم وغیرہ، سب بیان کیا ہوا ہوتا ہے۔ جب کوئی خریدنا چاہتا ہے تو انہی تفصیلات کی روشنی میں وہ فیصلہ کرتا ہے اور خریدتا ہے۔

اس طرح کی بیع کو فقہا کے یہاں "بیع بالصفة" کہا جاتا ہے اور بعض فقہا نے اس کو "بیع علی الصفات و البرامج" سے بھی تعبیر کیا ہے، چناں چہ مالکی فقیہ ابن الجلاب نے اپنی کتاب "التفریع" میں اس کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ مبیع کو دیکھے بغیر صرف اس کی صفات کی بنیاد پر بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

اکثر حضرات فقہاء کے نزدیک یہ جائز ہے کہ کسی سے ایسی چیز خریدی جائے جو مجلس عقد میں موجود نہ ہو، مگر اس کی صفت اس طرح بیان کر دی جائے کہ جہالت باقی نہ رہے۔

حنفیہ کے یہاں تو اس میں مزید گنجائش ہے کہ صفت بیان نہ کرنے کے باوجود اس کی بیع درست ہے، مگر اس صورت میں خریدار کو خیار رویت بھی ملتا ہے۔

امام قدوری کہتے ہیں:

" و من اشتری ما لم یره فالبیع جائز ، و له الخیار إذا رآه إن شاء أخذه ، و إن شاء رده."

(جو شخص ایسی چیز خریدے جسے اس نے دیکھا نہ ہو تو یہ بیع جائز ہے اور اسے اختیار رہو گا کہ جب اس چیز کو دیکھے تو اگر چاہے تو لے لے اور اگر چاہے تو رد کر دے۔(۱)

اور امام مالک کے نزدیک یہ بیع اس وقت درست ہو گی جبکہ صفت بیان کرے اور اس طرح بیان کرے کہ اس کا دوسری اشیاء سے امتیاز ہو جائے۔

مالکی فقہ کی کتاب "ارشاد السالک" میں لکھا ہے:

(۱) مختصر القدوري:۱۸۷

”یجوز .... بیع الغائب على الصفة فيما يغلب مصادفته عليها، و لا يمكن الإطلاع عليه حال العقد، فيذكر منها ما يميزه عن غيره، و تختلف الأغراض و الأثمان بها، فإن وافق لزم، و إلا ثبت للمبتاع الخيار.“

(بیع الغائب علی الصفۃ ان چیزوں میں جائز ہے جن میں چیز کا اسی بیان کردہ صفت پر پایا جانا غالب ہو اور اس پر مطلع ہونا حالت عقد میں ممکن نہ ہو، پس ان صفات میں سے وہ صفات بیان کردے جو اس چیز کو دوسری چیزوں سے ممتاز کردیتی ہوں اور جن کی وجہ سے چیزوں کے اغراض اور قیمتیں مختلف ہوجاتی ہیں، پس اگر وہ چیز اس کے موافق ہو تو بیع لازم ہوگی ورنہ خریدار کے لیے اختیار ثابت ہوگا۔(۱)

علامہ دسوقی نے مالکیہ کے مسلک کی تفصیل میں یہ لکھا ہے کہ بیع غائب کی چھ صورتیں ہیں: کیوں کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو صفت بیان کی جائے، یا صفت بیان نہ کی جائے، پھر ان میں سے ہر ایک کی تین صورتیں ہیں: یا تو لازمی طور پر بیع کی جائے، یا خیار کی بنیاد پر، یا اس کی کوئی بات ہی نہ ہو، بل کہ سکوت ہو۔ علامہ دسوقی کہتے ہیں کہ یہ ساری صورتیں جائز ہیں سوائے دو صورتوں کے: ایک وہ جس میں صفت بیان نہ کی جائے اور بیع لزوماً کی جائے اور دوسری وہ جس میں صفت بیان نہ کی جائے اور لزوم یا خیار سے سکوت ہو۔(۲)

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مبیع کی صفت بیان کی گئی ہو تو غائب ہونے کے باوجود اس چیز کی بیع درست ہے اور اگر مبیع غائب کی صفت بیان نہ کی گئی ہو تو اس بارے میں ان سے دو روایات ہیں۔

حنبلی فقیہ علامہ شمس الدین ابن قدامہ ”الشرح الکبیر“ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) إرشاد السالک: ۱۸۳/۱

(۲) حاشیة الدسوقی: ۲۵/۳

" إذا ذكر له من صفات المبيع ما يكفي في صحة السلم صح بيعه في ظاهر المذهب ، و هو قول أكثر أهل العلم. و عنه لا يصح حتى يراه ؛ لأن الصفة لا تحصل بها معرفة المبيع ، فلم يصح البيع بها، كالذى لا يصح السلم فيه . و لنا أنه بيع بالصفة فصح كالسلم ، و لا نسلم أن الصفة لا يحصل بها المعرفة ؛ فإنها تحصل بالصفات الظاهرة التي لا يختلف بها الثمن ظاهراً، و لهذا اكتفي به في السلم، و لأنه لا يعتبر في الرؤية الاطلاع على الصفات الخفية ."

(اگر خریدار کے لیے مبیع کی صفات میں سے وہ صفات بیان کردے جو بیع سلم کے صحیح ہونے کے لیے کافی ہیں تو ظاہر مذہب میں یہ بیع صحیح ہوگی اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے اور امام احمد رحمہ اللہ سے دوسرا قول یہ منقول ہے کہ جب تک چیز کو دیکھتا نہیں ، بیع صحیح نہیں ہوتی ؛ کیوں کہ صفت بیان کردینے سے مبیع کی پوری معرفت حاصل نہیں ہوتی ، لہذا بیع اس سے صحیح نہیں ہوتی ، جیسے کہ وہ صورت جس میں بیع سلم صحیح نہیں ہوتی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ بیع بالصفۃ ہے، لہذا بیع سلم کی طرح یہ بھی جائز ہے اور ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صفات بیان کرنے سے مبیع کی معرفت حاصل نہیں ہوتی ؛ کیوں کہ صفات ظاہرہ سے جن کی بناپر ظاہری لحاظ سے قیمت مختلف نہیں ہوتی مبیع کی جان کاری حاصل ہوجاتی ہے اور اسی وجہ سے اس کو بیع سلم میں کافی سمجھا گیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ رویت کی صورت میں بھی صفات خفیہ پر مطلع ہونے کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔(۱)

اور "الانصاف" میں المرداوی نے لکھا ہے:

(۱) الشرح الکبیر:۲۵/۴

"إذا لـم يـر الـمبيـع فتارة يوصف له وتارة لا يوصف فإن لم يـوصف لـه لـم يـصـح البيـع على الصحيح من المذهب وعليه الأصحاب وعنه يصح."

(اگر مبیع کو دیکھا نہیں تو کبھی اس کا وصف بیان کیا جاتا ہے اور کبھی وصف بیان نہیں کیا جاتا، پس اگر وصف بیان نہیں کیا گیا تو مذہب میں صحیح قول کے مطابق بیع صحیح نہیں ہے اور ہمارے اصحاب بھی اسی پر ہیں اور ایک قول امام احمد سے یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے۔(۱))

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کے اس مسئلے میں دو قول ہیں؛ چناں چہ علامہ خطیب الشربینی نے لکھا ہے:

"فـي بيـع الأعيان الغائبة و الحاضرة التي لم تر قولان: قال فـي الـقـديـم و الإملاء و الصرف من الجديد: يصح، و به قال مـالـك و أبو حنيفة و أحمد -رحـمهـم الـله- و قال بتصحيحه طـائـفة من أئمتنا و أفتوا به، منهم البغوي و الروياني، و قال في الأم و البويطي لا يصح وهو اختيار الـمزني."

(غائب چیزوں اور ان حاضر چیزوں کے سلسلے میں جن کو دیکھا نہیں جاتا، دو قول ہیں: امام شافعی کے قول قدیم میں اور املاء اور صرف کے جدید قول میں ان کی بیع صحیح ہے اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا یہی قول ہے اور ہمارے ائمہ کی ایک جماعت نے اسی کو صحیح قرار دیا اور اسی کے مطابق فتوی دیا ہے، جن میں امام بغوی اور امام رویانی بھی ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں اور بویطی کی روایت میں کہا کہ ان کی بیع صحیح نہیں ہے اور اسی

(۱) الإنصاف: ۲۱۳/۴

کومزنی نے اختیار کیا ہے۔) (۱)

اسی طرح البجیرمی نے منہاج کے حاشیہ میں اور امام غزالی نے الوسیط میں ذکر کیا ہے، البجیرمی کی عبارت یہ ہے:

" وَالْأَظْهَرُ أَنَّهُ لا يَصِحُّ بَيْعُ الْغَائِبِ ، وَالثَّانِي وَ بِهِ قَالَ الْأَئِمَّةُ الثَّلَاثَةُ :يَصِحُّ الْبَيْعُ إِنْ ذُكِرَ جِنْسُهُ أَيْ:أَوْ نَوْعُهُ ، وَإِنْ لَمْ يَرَيَاهُ وَيَثْبُتُ الْخِيَارُ لِلْمُشْتَرِي عِنْدَ الرُّؤْيَةِ."

(اظہر یہ ہے کہ بیع غائب صحیح نہیں ہے اور دوسرا قول اور اسی کے باقی تین ائمہ بھی قائل ہیں، یہ ہے کہ بیع غائب صحیح ہے اگر مبیع کی جنس اور نوع بیان کردی جائے ،اگر چہ کہ متعاقدین نے اس کو نہ دیکھا ہو اور رویت کے وقت خریدار کو اختیار ملے گا۔(۲)

الغرض اکثر فقہا کے نزدیک غائب چیز کی بیع جائز ہے اور اس کا وصف بیان کر دیا جائے تو اس صورت میں فقہا کی اکثریت اس کو جائز قرار دیتی ہے ؛ حتی کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں بھی اس کا جواز ہی راجح ہے۔

لہذا الکٹرانک کاروبار میں جو مبیع کا وصف وکیفیت بیان کر کے اس کی تمام ضروری باتوں کو واضح کر دیا جاتا ہے، تو اس طرح یہ کاروبار اکثر علما وفقہا کے نزدیک جائز و درست ہے۔

الکٹرانک کاروبار میں خیار رویت

البتہ یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر کسی نے ساری تفصیلات جاننے کے بعد کوئی چیز خریدی تو کیا اب اسے خیار رویت حاصل رہے گا یا نہیں؟

علمائے حنفیہ نے لکھا ہے کہ خیار رویت کا جو ذکر آتا ہے، اس سے مقصود تو مبیع کے وصف کا علم ہی ہے، لہذا جہاں وصف اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مبیع کی پہچان ایک حد تک

(۱) الإقناع :۲۱۱/۱

(۲)حاشية البجيرمي على المنهاج:۳۷۹/۶

اس طرح ہوگئی کہ جھگڑے کی نوبت نہ آئے تو اس سے خیار رویت ساقط ہو جاتا ہے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص ایک غائب چیز کا سودا کرے تو یہ بیع جائز ہو جاتی ہے اور اس کو خیار رویت ملتا ہے، مگر رویت سے مراد وہی وصف و کیفیت کا معلوم ہو جانا ہے، لہذا جب وصف و کیفیت مبیع کی معلوم ہونے کے بعد خریدا تو اس کو خیار رویت نہیں ملے گا۔

علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ نے "البحر الرائق" میں اور انہی کے حوالے سے علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن سلیمان القلیوبی نے "مجمع الانہر" میں اور علامہ شامی نے "رد المحتار" میں فرمایا:

"وَ الْمُرَادُ بِالرُّؤْيَةِ الْعِلْمُ بِالْمَقْصُودِ من بَابِ عُمُومِ الْمَجَازِ ، فَصَارَتْ الرُّؤْيَةُ مِن أَفْرَادِ الْمَعْنَى الْمَجَازِ لِيَشْمَلَ ما إذَا كان الْمَبِيعُ مِمَّا يُعْرَفُ بِالشَّمِّ كَالْمِسْكِ ، و ما اشْتَرَاهُ بَعْدَ رُؤْيَتِهِ فَوَجَدَهُ مُتَغَيِّراً ، و ما اشْتَرَاهُ الْأَعْمَى ."

(رویت سے مراد عموم مجاز کی قبیل سے مقصود چیز کا علم ہو جانا ہے، لہذا رویت معنی مجاز کے افراد میں سے ہوگئی؛ تا کہ یہ ان صورتوں کو بھی شامل ہو جائے کہ مبیع سونگھی جانے والی چیزوں میں سے ہو جیسے مشک اور یہ کہ مبیع دیکھنے کے بعد خریدا ہو پھر اس کو اس صفت سے متغیر پائے اور یہ کہ نابینا نے خریدا ہو۔(۱)

لہذا اصل مقصود مبیع کی حالت و کیفیت کا علم ہے، جب ایک شخص اس کو کسی بھی طرح جان لے تو یہ بات جائز ہے کہ اس کی خریدی کرے اور اس کے بعد اس کو خیار رویت نہ ہوگا۔

یہ بات جو حضرات فقہا نے لکھی ہے، اس بیع کے بارے میں ہے جو عادی و عام ہے؛ لیکن جہاں تک الکٹرانک کاروبار کا مسئلہ ہے، اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا ویب سائیٹ پر تصویروں کے ذریعے یا کسی بروشر پر لکھی ہوئی تفصیلات سے بات اس قدر واضح ہو جاتی ہے کہ اس کو فقہا کے کلام پر منطبق کیا جا سکے؟

---

(۱) البحر الرائق:۲۹/۶، شامی:۵۹۳/۴

اگر ہم اس پر فقہا کے کلام کو منطبق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تفصیلات کو معلوم کر لینے کے بعد اس کا خیار رویت ساقط ہو گیا اور وہ گویا اس چیز سے راضی ہو گیا، لہٰذا جب وہ اپنی خریدی ہوئی اس چیز کو حاصل کرے تو اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ خیار رویت کی بنا پر واپس کر دے۔

اور اگر ہم اس کو فقہا کے کلام پر منطبق نہیں سمجھتے تو پھر اس کو خیار رویت حاصل ہوگا اور جب وہ اپنی خریدی ہوئی چیز کو پائے تو اس کو اختیار ہوگا کہ وہ لوٹا دے۔

مگر دونوں صورتوں میں صعوبت وحرج ہے، پہلی صورت میں جبکہ ہم اس کو کلام فقہا پر منطبق مانیں، خریدار کے لیے صعوبت کا باعث ہے اور اگر ہم اس کو کلام فقہا پر منطبق نہ مانیں تو بائع کے لیے صعوبت ہے۔

اس لیے احقر کی رائے یہ ہے کہ اس میں اگر مبیع ان اوصاف کے مطابق ہو تو خریدار کو واپسی کا اختیار نہ ہونا چاہیے اور اگر ان اوصاف کے مطابق نہ ہو تو اس کو واپسی کا حق ہونا چاہیے۔ یہ فیصلہ بین بین حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تائید ان فقہا کے کلام سے ہوتی ہے جو "بیع بالصفة" اور "بیع علی البرنامج" کی صورت میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر مبیع اس صفت کے مطابق ہو تو واپسی کا حق نہیں رہتا، بل کہ بیع لازم ہو جاتی ہے۔

چناں چہ فقہ مالکی کی کتاب "الثمر الدانی" میں ہے:

"فإن وجده على الصفة التي في البرنامج لزمه البيع ولا خيار له وإن وجده على غيرها فهو بالخيار باللزوم والفسخ."

(پس اگر مبیع کو اس صفت پر پایا جو دفتر میں لکھی ہوئی ہے تو بیع لازم ہو گئی اور خریدار کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہوگا اور اگر اس صفت کے خلاف مبیع کو پایا تو خریدار کو اختیار رہوگا کہ لازم کر لے یا فسخ کر دے۔(۱)

(۱) الثمر الدانی: ۵۲۱/۱

اورعلامہ ابوالحسن المالکی رحمہ اللہ نے ”كفاية الطالب الرباني“میں فرمایا ہے:

”فإن وجده على الصفة التي في البرنامج لزمه البيع ولا خيار له وإن وجده على غيرها فهو بالخيار في لزوم البيع وفسخه.“

(پس اگر مبیع کو اس صفت پر پایا جو دفتر میں لکھی ہوئی ہے تو بیع لازم ہوگئی اورخریدار کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہوگا اور اگر اس صفت کے خلاف مبیع کو پایا تو خریدار کو اس بیع کے لازم کرنے یا فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔(۱)

اور ”الفواكه الدواني“میں ہے:

”فأقيمت الصفة مقام الرؤية، فإن وجد على الصفة لزم المشتري، وإلا خير المشتري.“

(پس یہاں صفت بیان کرنے کو رویت کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے،لہذا اگر مبیع کو اس صفت کے مطابق پائے تو وہ بیع خریدا کو لازم ہوگی ورنہ خریدار کو اختیار دیا جائے گا۔(۲)

اورفقہ حنبلی میں بھی اسی کو لیا گیا ہے، چناں چہ علامہ شمس الدین بن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے ”الشرح الكبير“میں فرمایا:

”إذا ثبت هذا فإنه متى وجده على الصفة لم يكن له الفسخ، و بهذا قال ابن سيرين ، و أيوب ، ومالک ، و العنبری، و اسحاق ، و أبو ثور، و ابن المنذر .“

(جب یہ بات ثابت ہوگئی تو جو شخص مبیع کو اسی صفت پر پائے تو اس کو فسخ کا اختیار نہ ہوگا ، یہی قول ابن سیرین ، ایوب ، مالک ،عنبری ، اسحاق ، ابوثور اور

(۱) كفاية الطالب الرباني:۲/۲۴۳

(۲) الفواكه الدواني:۳/۱۱۵۶

ابن المنذر رکا ہے۔(۱)

اور المرداوی نے ''الإنصاف'' میں لکھا ہے:

" و اعلم أن للمشتری الفسخ إن وجده متغیراً ، أو وجده علی خلاف ما وصفه له علی الصحیح من المذهب مطلقاً . "

(جاننا چاہئے کہ خریدا کو فسخ کرنے کا حق ہے اگر چیز کو بدلا ہوا پائے یا اس صفت کے خلاف پائے جو بیان کی گئی تھی، یہ مذہب کے صحیح قول کے مطابق ہے۔(۲)

لہٰذا ان ائمہ کرام کے مسلک کے مطابق گنجائش ہے کہ ہم مبیع کے موافق وصف ہونے کی صورت میں خریدار کے اختیار کو ساقط مانیں اور اگر وصف کے موافق نہ ہو تو اس کا اختیار تسلیم کریں۔

ایک ضروری وضاحت

یہاں تک چند اہم اصولوں کی روشنی میں ''الکٹرانک کاروبار'' کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ لیکن یہاں یہ یاد رہے کہ یہاں ہم نے بیع وشراء سے متعلق تمام اصول بیان نہیں کئے ہیں؛ کیونکہ مقصود صرف ان اصولوں کو زیر بحث لانا تھا جن کی رو سے الکٹرانک کاروبار کے سلسلے میں کوئی پیچیدگی اور ابہام ہوسکتا تھا۔

باقی دیگر اصول جو اس سلسلے میں واضح تھے، ہم نے ان کو ذکر نہیں کیا، جیسے یہ اصول کہ خریدی اور بیچی جانے والی چیز جائز وحلال ہونا چاہئے اور یہ کہ مقدور التسلیم ہونا چاہئے، وغیرہ، کیونکہ یہ اصول سب کو معلوم بھی ہیں اور واضح بھی، لہٰذا ان کے بیان وتشریح کی ضرورت نہ تھی۔

الکٹرانک کاروبار میں ''بیع الصرف'' کا حکم

''الکٹرانک کاروبار'' کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیع الصرف کی

(۱) الشرح الکبیر :۲۶/۴

(۲) الإنصاف:۲۱۵/۵

بھی گنجائش ہے؟ جواب یہ ہے کہ بیع الصرف میں چوں کہ علی الفور دونوں جانب سے قبضہ لازم ہے اور وہ یہاں نہیں ہوسکتا، لہذا الکٹرانک کاروبار میں "بیع صرف "کی اجازت نہ ہوگی۔

بیع الصرف کی تعریف اور حکم

سونے و چاندی کے کاروبار کی ایک صورت یہ ہے کہ خود سونے و چاندی کے بدلے کاروبار ہو اور اس کی تین صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ سونے کو سونے سے تبادلہ کیا جائے۔

دوسری یہ کہ چاندی کو چاندی سے تبادلہ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ سونے کے بدلے چاندی یا چاندی کے بدلے سونے کی خرید وفروخت کی جائے۔

ان تینوں صورتوں سے کاروبار کو شرع میں "بیع الصرف" کہتے ہیں۔

چناں چہ امام قدوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" الصرفُ هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنسالأثمان "

(صرف وہ بیع ہے جس کے دونوں عوض از قبیل ثمن ہوں۔)(۱)

الجوهرة النيرة میں ہے:

" الصرف اسم لعقود ثلاثة :بيع الذهب بالذهب ، و الفضة بالفضة و أحدهما بالآخر. "

(صرف تین قسم کے عقد کا نام ہے:ایک سونے کے بدلے سونا بیچنا دوسرے چاندی کے بدلے چاندی بیچنا اور تیسرے سونے کے بدلے چاندی یا چاندی کے بدلے سونا بیچنا۔)(۲)

---

(۱) مختصر القدوري :۹۰

(۲) الجوهرة النيرة:۲/۲۴۳

دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام میں ہے:

”(الصَّرْفُ بَيْعُ النَّقْدِ بِالنَّقْدِ)يَعْنِي أَنَّ بَيْعَ الصَّرْفِ هُوَ بَيْعُ الذَّهَبِ الْمَسْكُوكِ أَوْ غَيْرِ الْمَسْكُوكِ بِذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ وَالْفِضَّةِ بِذَهَبٍ أَوْ مِثْلِهَا فِضَّة.“

(صرف ثمن کے بدلے ثمن کی بیع ہے یعنی بیع الصرف ڈھالے گئے یا نا ڈھالے گئے سونے کی سونے کے بدلے بیع ہے یا چاندی کی چاندی کے بدلے بیع ہے، یا چاندی کی سونے کے بدلے یا سونے کی چاندی کے بدلے بیع ہے۔(۱)

اور علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”(هو بَيْعُ بَعْضِ الْأَثْمَانِ بِبَعْضٍ)كَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ إذَا بِيعَ أَحَدُهُمَا بِالْآخَرِ أَيْ بِيعَ ما من جِنْسِ الْأَثْمَانِ بَعْضُهَا بِبَعْضٍ.“

(وہ ثمن میں سے بعض کی بعض کے بدلے بیع ہے، جیسے سونا اور چاندی جب ایک کو دوسرے کے بدلے بیچا جائے، یعنی جب ثمن میں سے بعض کو بعض سے بیچا جائے۔)(۲)

امام برهان الدین مازۃ نے ”المحيط البرهاني“ میں لکھا ہے:

” الصرف اسم لنوع و هو مبادلة الأثمان بعضها ببعض، إما مبادلة الذهب أو مبادلة الفضة بالفضة ، أو مبادلة أحد الجنسين بصاحبه ، مفرداً كان أو مجموعاً مع غيره.“ (۳)

ان تمام عبارات سے معلوم ہوا کہ بیع الصرف بیع الاثمان کا نام ہے یعنی ثمن کے بدلے ثمن کو بیچا خریدا جائے اور ان کی تین صورتیں ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

(۱) درر الحكام:۹۸/۱

(۲) البحر الرائق:۲۰۹/۶

(۲) المحيط البرهاني:۳۵۲/۷

پھران تین صورتوں میں سے پہلی اور دوسری صورت میں یعنی جب سونے کے بدلے سونا اور چاندی کے بدلے چاندی کی خرید وفروخت ہوتو دو باتیں لازم ہیں: ایک مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ دوسرے برابر سرابر ہونا یعنی کمی بیشی نہ ہونا اور تیسری صورت میں ان میں سے ایک بات یعنی مجلس میں قبضہ لازم ہے لیکن برابر سرابر ہونا لازم نہیں کمی بیشی کے ساتھ ان میں معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ "بدائع الصنائع" میں فرماتے ہیں:

" ثُمَّ بَيْعُ الْجِنْسِ بِالْجِنْسِ وَبِخِلَافِ الْجِنْسِ كَالذَّهَبِ بِالْفِضَّةِ سَوَاءٌ لا يَخْتَلِفَانِ فِي حُكْمِ الْقَبْضِ ؛ لِأَنَّ كُلَّ ذٰلِكَ صَرْفٌ فَيُشْتَرَطُ فِيهِ التَّقَابُضُ ، وَإِنَّمَا يَخْتَلِفَانِ فِي جَوَازِ التَّفَاضُلِ وَعَدَمِهِ فَلَا يَجُوزُ التَّفَاضُلُ عِنْدَ اتِّحَادِ الْجِنْسِ ، وَيَجُوزُ عِنْدَ الاخْتِلَافِ وَلَكِنْ يَجِبُ التَّقَابُضُ اتَّحَدَ الْجِنْسُ أَوْ اخْتَلَفَ ."

(پھر ایک جنس کی چیز کا اسی جنس کے بدلے بیچنا اور اس کے خلاف دوسری جنس سے بیچنا دونوں برابر ہیں، قبضے کے حکم میں دونوں میں اختلاف نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ دونوں صورتیں صرف ہی کی ہیں، لہذا ان میں تقابض شرط ہے، ہاں! یہ دونوں صورتیں تفاضل کے جواز اور عدم جواز میں مختلف ہیں۔ لہذا ان میں جنس کے اتحاد کی صورت میں تفاضل جائز نہ ہوگا اور جنس کے مختلف ہونے کی صورت میں جائز ہوگا، لیکن مجلس میں قبضہ دونوں صورتوں میں ضروری ہے خواہ جنس متحد ہو یا مختلف ہو۔)(۱)

فاریکس ٹریڈنگ کے طریق کار کا شرعی حکم

انٹرنیٹ کے ذریعے کئے جانے والے کاروبار ظاہر ہیں کہ سب یکساں نہیں ہیں، بل کہ

(۱) بدائع الصنائع: ۴/۴۵۴

اس سے مختلف قسم کے کاروبار ہوتے ہیں، ان میں بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز؛ لہذا تمام کا حکم ایک نہ ہوگا، بل کہ دیکھا جائے گا کہ کس کاروبار میں شرعی احکام کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور کس میں ان کو فراموش کیا گیا ہے۔

ان کاروباروں میں سے ایک کاروبار ”FOREX TRADING“ ”فاریکس ٹریڈنگ“ ہے جو دراصل FOREING EXCHANGE کا مخفف ہے اور اس کو FX TRADING اور MARGIN بھی کہتے ہیں اور عربی میں اس کو ”الشراء بالهامش“ کہتے ہیں اور اس میں انٹرنیٹ کے ذریعے لوگ مختلف ممالک کی کرنسیوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ اور اس وقت یہ مارکیٹ دنیا کا سب سے بڑا مارکیٹ سمجھا جاتا ہے۔

اور اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لیے کسی قابل اعتبار کمپنی کو واسطہ بنایا جاتا ہے اور وہ کمپنی اس کاروبار میں اپنے مقررہ کمیشن پر بروکر اور ایجنٹ کے فرائض انجام دیتی ہے اور یہ کمیشن کاروبار میں نفع ہو یا نقصان ہو ہر دو صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔

یہ بروکر کمپنی (جو درمیان میں واسطے کے طور پر کام کرتی ہے اس کے) کاروبار میں داخل ہونے والے کو بعض سہولیات فراہم کرتی ہے:

ایک تو یہ کہ خریداری کے لیے تاجر کو ساری رقم دینے کی ضرورت نہیں؛ بل کہ وہ جتنے کا کاروبار کرنا چاہتا ہے اس کا صرف پانچ فیصدی حصہ پہلے ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی رقم وہ ایجنٹ کمپنی اپنی جانب سے لگاتی ہے۔ مثلاً ایک لاکھ ڈالر کا کاروبار کرنا ہو تو خریدار کو صرف اس کا پانچ فی صد یعنی پانچ ہزار ڈالر جمع کرنا پڑتا ہے اور باقی ۹۵ ہزار ڈالر وہ کمپنی اس میں لگاتی ہے۔

دوسری یہ کہ کاروبار کے اتار چڑھاؤ اور نفع ونقصان کے بارے میں یہ ایجنٹ کمپنی خریدار کو معلومات فراہم کرتی ہے۔

تیسری یہ کہ کاروباری مشورہ بھی فراہم کرتی ہے کہ کونسی چیز خریدنا مناسب ہے اور زیادہ نفع بخش ہے۔

اس کا طریق کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص فاریکس ٹریڈنگ سے کاروبار کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے کسی ایسی کمپنی کے واسطے سے اپنا ایک ضمنی اکاؤنٹ (SUB ACCOUNT) کھلوانا ہوتا ہے اور اس میں ایک رقم جمع کرنا پڑتا ہے اور یہ جمع کی جانے والی رقم کاروبار کے لحاظ سے پانچ فی صد ہونی چاہیئے۔

اور جب کوئی شخص اس کاروبار میں اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر داخل ہو جاتا ہے تو اس کو اس میں خرید وفروخت کا حق مل جاتا ہے، لہذا وہ فون یا ای میل یا فیاکس کے ذریعے اس ایجنٹ کمپنی کو کسی ملک کی کرنسی خریدنے کا آڈر دیتا ہے اور وہ کمپنی اس کے نام سے اس کو خرید لیتی ہے اور پھر جب اس کی قیمت بڑھتی ہے اور کمپنی فروخت کر دینے کا مشورہ دیتی ہے تو یہ اس کو فون سے یا ای میل یا فیاکس کے ذریعے بیچنے کا آڈر دیتا ہے اور کمپنی اس کو بیچ دیتی ہے۔

مگر یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کاروبار میں سارا معاملہ کاغذی طور پر عمل میں آتا ہے، مثلاً خریدار نے کمپنی کو خریدنے کا حکم بھیجا اور اس نے خرید کیا تو اس خریداری سے حاصل ہونے والی کرنسی حسی طور ہر نہ یہ خریدار اپنے قبضے میں لیتا ہے اور نہ وہ کمپنی جو اس کی جانب سے کام کرتی ہے وہ لیتی ہے، بل کہ صرف حساب میں لکھ لیا جاتا ہے کہ اس نے اس قدر کرنسی خریدی ہے۔اسی طرح جب وہ بیچتا ہے تو یہ بھی اس کے اکاؤنٹ میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اس نے وہ کرنسی فلاں کرنسی کے بدلے بیچ دی۔

اور اس خریداری اور فروختگی سے جو نفع ہو اس میں سے وہ ایجنٹ کمپنی اپنا کمیشن کاٹنے کے بعد اس تاجر کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیتی ہے۔اور اگر اس میں نفع کے بجائے نقصان ہوا تو وہ کمپنی مذکورہ شخص سے اپنا نقصان وصول کر لیتی ہے۔اور اس میں ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ خریدا ہوا مال اگر اسی دن بیچ دیا گیا تو مقررہ کمیشن کمپنی لیتی ہے اور اگر اس میں تاخیر ہوئی تو ہر دن کے لحاظ سے اس میں ایک خاص مقدار کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

جب فاریکس ٹریڈنگ کا طریق کار ہم نے سمجھ لیا تو اب سوال یہ ہے کہ یہ طریق کار

شرعی لحاظ سے جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طریق کار متعدد غیر شرعی امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ اس میں خریدار کا مبیع پر کسی قسم کا قبضہ نہیں ہوتا، نہ حقیقی، نہ حکمی اور یہ ظاہر کہ مبیع پر قبضے کے بغیر اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں؛لہذا یہ کاروبار جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اس میں قبضہ پایا جاتا ہے، اس طور پر کہ مذکورہ ایجنٹ کمپنی خریدار کی جانب سے اس پر قبضہ کرتی ہے،تو عرض ہے کہ بات ایسی نہیں؛ کیوں کہ جیسا کہ عرض کیا گیا- اس کاروبار میں خریدی ہوئی کرنسی کو الگ کر کے لیا نہیں جاتا؛ بل کہ صرف کاغذی کارروائی کے ذریعے اس کے اکاؤنٹ میں لکھ دیا جاتا ہے اور اتنی بات قبضے کے لیے کافی نہیں؛ کیوں کہ حسب تصریح فقہائے کرام بیع میں لازم ہے کہ بائع مبیع کو اپنی چیز سے الگ کر کے حوالے کرے اور وہ چیز کسی اور کے حق میں مشغول نہ ہو۔

فقہائے کرام نے صحت تسلیم کے لیے اس بات کو لازم قرار دیا ہے کہ بائع مبیع کو اس طرح الگ کر کے حوالے کرے کہ وہ دوسرے کے حق میں مشغول نہ رہے۔ چناں چہ متعدد فقہا نے لکھا ہے:

"وَأَنْ يَكُونَ مُفْرزًا غَيْرَ مَشْغُولٍ بِحَقِّ غَيْرِه."

(مبیع اس طرح الگ وممتاز ہو کہ دوسرے کے حق میں مشغول نہ رہے۔)(۱)

اور ظاہر ہے کہ یہاں اس طرح نہیں ہوتا، بل کہ جب لاٹ خریدی جاتی ہے تو صرف خریدار کے اکاؤنٹ میں وہ مقدار درج کر دی جاتی ہے، نہ خود خریدار اس پر قبضہ کرتا ہے اور نہ اس کی جانب سے وہ ایجنٹ کمپنی اس پر قبضہ کرتی ہے، لہذا اس میں قبضہ کسی طرح متحقق نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس میں وہ ایجنٹ کمپنی تاجر کو قرض فراہم کرتی ہے اور یہ خود اس کی ملک میں نہیں ہوتا، صرف حساب کتاب میں ہوتا ہے؛ کیوں کہ جس قدر قرض وہ فراہم کرتی

(۱) فتح القدير:۶/۲۹۷، البحر الرائق:۸،مجمع الأنهر:۳/۳۲

ہے اس کے پاس وہ موجود نہیں ہوتی ،اسی طرح جب یہ تاجر کمپنی سے قرض لے کر اس کو دوسروں کو فروخت کرتا ہے تو وہ بھی اس کے پاس نہیں ہوتی ،صرف حساب کتاب میں یہ درج ہوتا ہے۔لہذا یہ سارا معاملہ '' بیع معدوم'' کے تحت داخل ہے اور یہ ممنوع ہے۔

حدیث میں ہے:

حضرت حکیم بن حزام نے نقل کیا کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ:

'' لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ .''

(جو چیز تیرے پاس نہ ہو اس کو نہ بیچنا۔)(۱)

(۳) تیسرے یہ کہ اس میں قرض پر کمیشن پایا جاتا ہے؛ کیوں کہ وہ ایجنٹ کمپنی جو اس تاجر کو ۹۵ فی صد رقم کاروبار کے لیے فراہم کرتی ہے، اس پر وہ کمیشن یعنی سود لیتی ہے اور حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا کہ:

''كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا''

(جو قرض نفع لائے وہ سود ہے۔)(۲)

نیز کمپنی کا تاجر کے ساتھ یہ معاملہ کہ اگر فروختگی میں تاخیر ہوئی تو ہر دن کے بدلے اس قدر رقم کا اضافہ ہوگا یہ بھی خالص سود ہے،لہذا کمپنی کا تاجر سے یہ معاملہ سودی معاملہ ہے؛ اس وجہ سے بھی یہ حرام و ناجائز ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ اس کاروبار میں لوگوں کا مقصود کرنسی نہیں ہوتی ، بل کہ اس خرید و فروخت سے ان کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ کرنسی کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے نفع کما لیا جائے ،نہ کوئی کرنسی ان کی ملک میں داخل ہوتی ہے اور نہ ان کے قبضے میں آ کر ان کے ضمان میں آتی ہے۔اور اسی کو شریعت میں سٹہ بازی اور قمار کہتے ہیں اور یہ حرام و ناجائز ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ اس عقد میں قرض اور بیع دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے؛ کیوں کہ ایجنٹ

(۱) أبو داود:۳۵۰۵، ترمذي:۱۲۳۲، نسائي:۴۶۱۳،ابن ماجه:۲۱۸۷

(۲) سنن بيهقي:۳۵۰/۵

کمپنی تاجر کو قرض دیتی ہے اور یہ شرط لگاتی ہے کہ یہ عقد اسی صورت سے ہوگا کہ اس کمپنی کو واسطہ بنایا جائے ، اس طرح اس عقد میں قرض و بیع دونوں جمع کر دئے گئے ہیں ، جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

" أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نَهى عَنْ سَلَفٍ وَبَيْعٍ ، وَ شَرْطَيْنِ فِي بَيْعٍ ، وَ رِبْحِ مَا لَمْ يُضْمَنْ ."

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض اور بیع سے اور ایک بیع میں دو شرطوں سے اور ایسی چیز کے نفع سے منع کیا ہے جو ضمان میں نہ ہو۔)(۱)

ایک روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

" لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَ بَيْعٌ ، وَ لاَ شَرْطَانِ فِي بَيْعٍ ، وَ لاَ رِبْحُ مَا لَم يُضْمَنْ."

(قرض اور بیع کو جمع کرنا جائز نہیں اور نہ بیع میں دو شرطوں کو اور نہ ایسی چیز کا نفع لینا جو ضمان میں نہیں آیا۔)(۲)

(۶) چھٹے یہ کہ اس عقد میں چوں کہ خریدار صرف پانچ فی صد رقم جمع کرتا ہے اور باقی رقم جو اس کو کمپنی فراہم کرتی ہے وہ اس پر دین ہوتی ہے ، پھر اس کو کرنسی فروخت کرنے والا بھی اسے کوئی قبضہ نہیں دیتا جیسا کہ اوپر گزر گیا ، لہٰذا ادھر بھی دین ہوا ، اس طرح خرید و فروخت کی دونوں جانب سے یہاں دین ہوتا ہے ، جس کو بیع الکالی بالکالی کہا جاتا ہے اور یہ بھی شرعا نا جائز ہے ؛ کیوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ

" أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم نَهى عَنْ بَيْعِ الْكَالِي بِالْكَالِي "

---

(۱) سنن نسائی صغری:۴۶۲۹ ، سنن کبری نسائی :۶۱۸۰ ، سنن بیهقی :۵/۳۳۶

(۲) ترمذي:۱۲۳۴ ،سنن كبرى نسائی:۶۱۸۱

(نبی کریم نے دین کی دین کے بدلے بیع کرنے سے منع کیا ہے۔)(۱)

مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر "فاریکس ٹریڈنگ" کا یہ طریقہ ناجائز ہے،اس سے بچنا واجب و لازم ہےاوراس طریقے سے کمائی ہوئی آمدنی بھی حرام وناجائز ہےجس سے احتراز لازم ہے۔

اس سلسلے میں بہت سے علمانے کلام کیا ہےاورتقریباً اکثر حضرات نے اس معاملے کو مذکورہ وجوہات یااوروجوہات کی بناپرحرام قرار دیا ہے،مثلاً:

شیخ یوسف بن عبد اللہ الشبیلی محاضر فقہ مقارن معہد العالی للقضاء نے اپنے مقالے "الخدمات المصرفية لاستثمار أموال العملاء و أحكامها في الفقه الإسلامي" میں لکھا ہے:

"من الواضح أن المعاملة بالصفة المذكورة آنفاً محرمة ؛ لأن فيها قرضاً بفائدة ، فالمشترى يشترى السهم ، و يدفع للسمسار فائدة مقابل مبلغ القرض الذى حصل عليه ، و السمسار يدفع فائدة للبنك مقابل مبلغ القرض لصالح العميل."

(یہ بات واضح ہے کہ یہ معاملہ اس کیفیت کے ساتھ جوابھی ذکر کیا گیا،حرام ہے؛ کیوں کہ اس میں سود کے ساتھ قرض ہے،پس خریدار حصہ(شیئر)خریدتا ہے اورحاصل شدہ قرض کے بدلے میں سود ایجنٹ کمپنی کو دیتا ہےاورایجنٹ کمپنی بینک کوسود دیتی ہےاس قرض کے بدلے میں جواس گاہک یا کلائنٹ کوملا ہے۔(۲)

اورشیخ احمد بن محمد الخلیل (استاذ الفقہ ، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ ، القصیم) اپنی کتاب "الأسهم و السندات و أحكامها في الفقه الإسلامي" میں اس کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" لا إشكال في تحريم هذا النوع من التعاملات ؛ لأنها من

(۱) دارقطنی:۳۰۶۱-۳۰۶۰،مستدرک:۲۳۴۲،شرح السنة:۲۰۹۱

(۲) الخدمات المصرفية :۱۹۲/۲

صميم الربا ، فالمشتري يقترض مالاً من السمسار بفائدةٍ ثابتةٍ متفق عليها.''

(اس قسم کے معاملات کے حرام ہونے میں کوئی شبہ واشکال نہیں ؛ کیوں کہ یہ خالص سود ہے؛ کیوں کہ خریدار ایجنٹ کمپنی سے ایک ایسے سود پر مال قرض لیتا ہے، جو اس معاملے پر دونوں کے اتفاق سے ثابت ہوتا ہے۔)(۱)

الغرض فاریکس ٹریڈنگ کا جو طریق کار رائج ہے، اس میں متعدد امور خلاف شرع ہیں، اس لیے اکثر علما وفقہا نے اس کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے، اور جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اس کی بنیاد اس معاملے کی پوری حقیقت سے ناواقفیت ہے، جیسے کہ ایک فتوی ''جامعۃ الازہر مصر'' کا نظر سے گذرا، کہ اس میں اس کے جواز کی جانب رجحان بیان کیا گیا؛ مگر جمہور علما نے جب اس کی پوری حقیقت کو سمجھا تو جو بات سامنے آئی وہ یہی ہے کہ یہ معاملہ متعدد غیر شرعی امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

(۱) الأسهم والسندات و أحكامها:۲۲۲

مقصد ثانی

الکٹرانک خدمات اور شرعی احکام

ہم نے اوپر جو گفتگو کی ہے وہ ''الکٹرانک بیع وتجارت'' سے متعلق تھی اور شروع بحث میں یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ الکٹرانک کاروبار کی ایک صورت خدمات (SERVICES) کی ہے، لہذا یہاں اس بارے میں نہایت مختصر کلام کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس میں بھی اکثر وہی اصول ہیں جو بیع وتجارت کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ ''الکٹرانک کاروبار'' میں یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف کمپنیاں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے واسطے سے اپنی اپنی خدمات پیش کرتی ہیں اور ان خدمات کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے، جیسے:

(۱) ویب سائیٹ بنانے کے لیے جگہ (Space) فراہم کرنا، جس میں سالانہ اجرت دیکر اس جگہ کو اپنی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۲) کسی خاص قسم کے سافٹ ویر کی خدمت فراہم کرنا۔

(۳) بعض چیزوں کو ڈاون لوڈ کرنے کی سہولت مہیا کرنا۔

(۴) بعض پروگرام کو چلانے کے لیے اس کا سافٹ ویر فراہم کرنا، وغیرہ۔

(۵) مختلف موضوعات اور فنون کی کتابوں سے استفادے کی سہولت دینا۔

(٦) انٹرنیٹ کے استعمال کی سہولت دینا۔ وغیرہ

پھر ان میں سے بعض کمپنیاں تو اپنی خدمات بلا معاوضہ فراہم کرتی ہیں اور بعض

معاوضے پر مہیا کرتی ہیں، جہاں تک معاملہ ہے بلا معاوضہ فراہم کرنے کا تو یہ ظاہر ہے کہ یہ عطیہ و ہبہ کہلائے گا اور اس کا جواز سب کو معلوم ہے اور اگر وہ معاوضے کے بدلے فراہم کرتی ہیں تو یہ معاملہ اجرت و کرایہ داری کا ہے اور اس سلسلے میں شرعی اصولوں کو پیش نظر رکھنے سے ان کے احکام کو معلوم کیا جا سکتا۔

شریعت میں اجارے کے اہم اصول

شریعت اسلامیہ میں اجارہ یعنی کرایہ داری کے سلسلے میں متعدد اصول ہیں، ان میں سے نہایت اہم اصول یہاں ذکر کرتا ہوں؛ تاکہ ان کی روشنی میں الکٹرانک خدمات کا حکم معلوم ہو جائے۔

(۱) کرایہ داری کے معاملے میں اکثر اصول وہی ہیں جن کا ذکر بیع وتجارت کے تحت گزر گیا، مثلاً ایجاب وقبول، مجلس کا اتحاد، وغیرہ، لہذا یہاں بھی ان امور کا لحاظ رکھنا لازم ہے، تاکہ الکٹرانک طریقے پر کیا جانے والا کرایہ داری کا معاملہ بھی شرعاً جائز وصحیح قرار پائے۔

(۲) اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جو خدمت حاصل کرنا ہے وہ شرعاً جائز ہونا چاہئے، اگر وہ خدمت ہی سرے سے جائز نہ ہو تو اس کا حاصل کرنا ہی حرام و ناجائز ہے، مثلاً بعض کمپنیاں گانے اور میوزک، گندی تصاویر، فلمیں، وغیرہ کو ڈاون لوڈ کرنے کی سہولت دیتی ہیں، مگر اس کا حاصل کرنا حرام و ناجائز ہے؛ کیونکہ یہ ساری چیزیں اسلامی نقطۂ نظر سے حرام ہیں۔

(۳) کرایہ داری میں مدت مقرر ہوتی ہے کہ اس چیز سے اتنی مدت تک فائدہ اٹھایا جائے گا، اور یہ مدت اکثر علما کے نزدیک خواہ لمبی ہو یا مختصر، دونوں طرح جائز ہے، لہذا جب وہ مدت پوری ہو جائے تو اجارہ ختم ہو جائے گا۔ مثلاً یہ طے ہوا کہ یہ ''سافٹ ویر'' ایک ماہ تک کے لیے فراہم کیا جاتا ہے اور اس کا ایک ماہ کا کرایہ اتنا ہوگا تو اس کے بعد وہ اجارہ ختم ہو جائے گا اور اگر کوئی مدت طے نہ ہوئی تو اگر کرایہ پر لینے والا اس کے بعد کے ماہ میں بھی

اس کا استعمال جاری رکھے گا تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس دوسرے ماہ میں بھی اس کو کرایہ پر لے لیا ہے، لہذا دوسرے ماہ کا کرایہ بھی اس پر لازم ہوگا۔

(۴) اجارہ پر جس چیز کا معاملہ ہو وہ مقدور التسلیم ہونا چاہیے، جیسے کہ بیع میں بھی یہی اصول ہے، اگر وہ چیز سپرد کئے جانے کا امکان نہ ہو تو ایسی چیز کا اجارہ باطل ہوگا۔ واللہ اعلم

۲۸؍محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
مطابق ۲۹؍اکتوبر ۲۰۱۶ء

حررہ العبد محمد شعیب اللہ خان
خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور